دل اسیرِ خیال تیرا ہے

عائشہ ناز علی

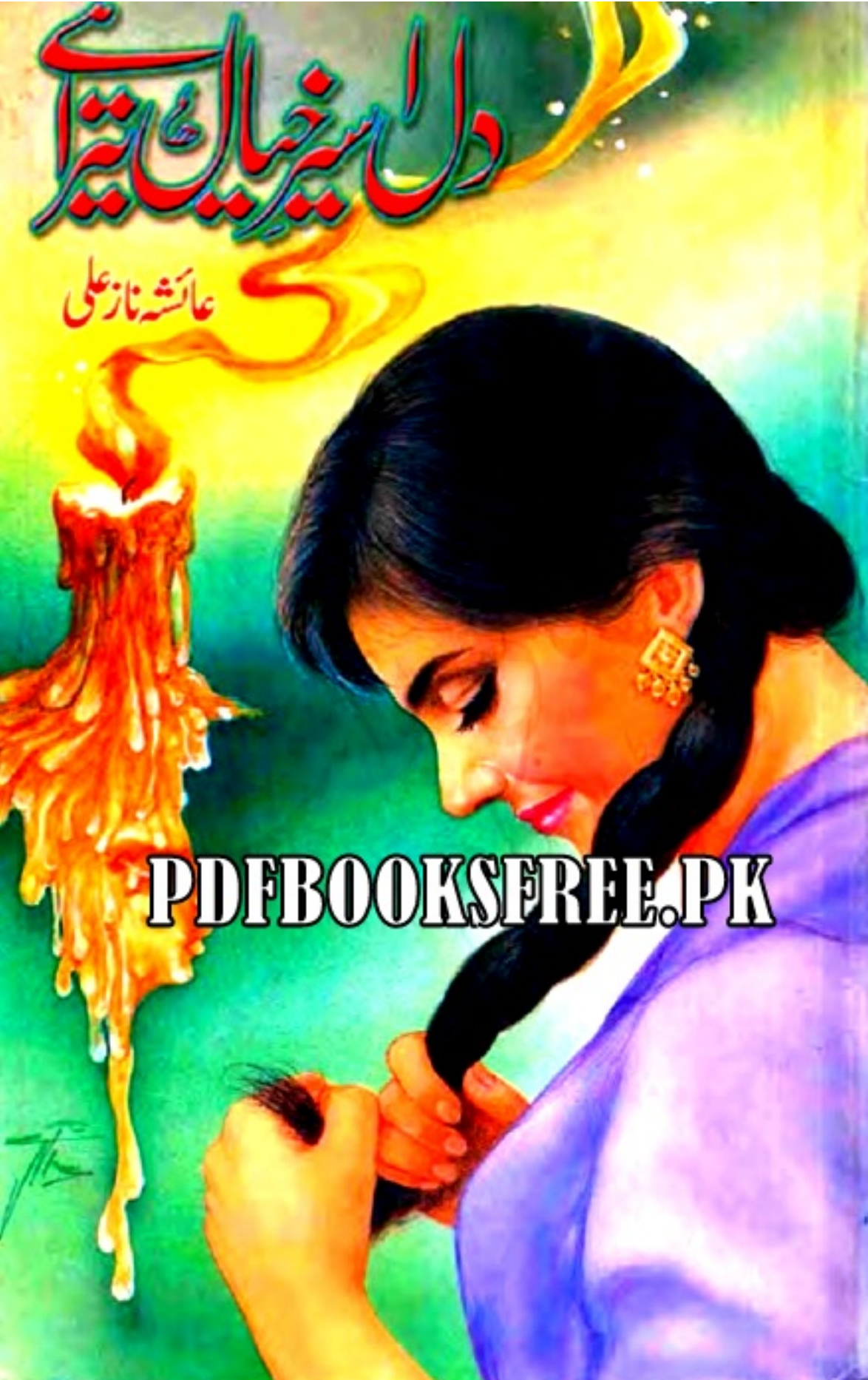

PDFBOOKSFREE.PK

''زیب النساء..... ہنہ، بھلا یہ بھی کوئی نام ہے..... پکارو تو یوں لگتا ہے جیسے سو سالہ بڈھی کھوسٹ عورت کو بلایا جا رہا ہے۔'' وہ برا سا منہ بنائے کہہ رہی تھی۔

اس وقت بھی لوگ اس ہال نما بڑے سے کمرے میں بیٹھے کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف تھے۔ وہ بھی عرشیہ وغیرہ سے باتوں میں مگن تھی کہ اچانک ہی باتوں کا موضوع بن گیا ''نام۔'' اسے اپنے نام پر سخت اعتراض تھا بلکہ اچھی خاصی چڑ تھی اور اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ یوں بھی اس جیسی ماڈرن لڑکی پر یہ نام قطعی سُوٹ نہ کرتا تھا۔ اس بات کا احساس بارہا اس کی فیشن ایبل سہیلیاں اسے دلا چکی تھیں۔

''آخر اعتراض کیوں ہے تمہیں اس نام پر؟ اتنا اچھا تو ہے۔'' عرشیہ مسکرا کے بولی۔

''اتنا ہی پسند ہے تو تم رکھ لو نا۔'' وہ چڑ کے بولی۔

''رکھ لیتی..... ضرور رکھ لیتی۔ اگر میرے پیارے پیارے دادا، دادی جی میرا نام عرشیہ جہاں نہ رکھ دیتے تو۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''حد ہو گئی..... سب کے نام ڈھنگ کے رکھ دیئے اور جب میری باری آئی تو سب اچھے ناموں کا کال پڑ گیا اور پنڈی سے نکلا یہ نام 'زیب النساء بیگم' جو کہ سن ''صفر'' کے ناموں میں سے ایک ہے۔'' وہ بڑی ناگواری سے بول رہی تھی۔ اس کی ''سن صفر'' کی اصطلاح پر سبھی مسکرانے لگے۔

''تو بدل ڈالو نا اپنا نام..... کچھ اور رکھ لو۔ مثلاً خیر النساء، مہر النساء وغیرہ وغیرہ۔'' زوبیہ نے مشورہ دیا تو وہ جل ہی گئی۔

''خود ہی رکھ لو تم یہ نام۔'' اس نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"رکھ لیتی اگر دادا جی کا ڈر نہ ہوتا۔" زوبیہ شوخی سے بولی۔

"ہنہ..... کاش میں اپنا نام بدل سکتی۔" وہ حسرت سے بولی۔

"صبر کرو ..... خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔" عرشیہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تو اس نے گھور کے اسے دیکھا۔

"مذاق اُڑا رہی ہو؟"

"ارے ارے، ہماری اتنی مجال کہاں کہ ایسی گستاخی کریں۔ ہم تو ہمدردی کر رہے ہیں۔ تمہارے سچے ہمدرد جو ہوئے۔" وہ گھبرانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

"پاس رکھو سنبھال کے اپنی ہمدردی۔ بدتمیز۔" زیب نے اسے ایک جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے ظالم! مار ڈالا، کمبخت!" عرشیہ اپنا سر سہلاتی ہوئی بولی۔

"اور کرو ہمدردی دشمنوں سے۔" علی کی شوخ آواز سنائی دی اور زیب نے یوں منہ بنا لیا جیسے کسی نے مٹھی بھر کونین کی کڑوی گولیاں اس کے منہ میں ڈال دی ہوں۔

"یہ تم نے یوں شکل کیوں بنا لی ہے بالکل کڑوے کریلے کی طرح؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"خدا نے شکل ہی کڑوے کریلے جیسی دی ہو تو بنا لینے کا کیا سوال ہے بھلا؟" علی فلور کشن پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولا اور زیب نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

"مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟" وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

"اجی ہم میں اتنی جرأت کہاں کہ آپ سے کچھ فرمائیں۔ ہم تو عرشیہ احمد سے مخاطب تھے۔" علی نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ وہ منہ بنا کر چپ ہو گئی۔ لیکن پھر خیال آیا تو اسے گھورنے لگی۔

"اب کیا خطا سرزد ہو گئی ہم سے؟" علی نے گھبرا کے پوچھا۔

"یہ کریلا کسے کہا تھا آپ نے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"جسے کہا ہے وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔" علی مسکرا کے بے نیازی سے بولا۔

"اگر میں کریلا ہوں تو آپ نیم کا درخت ہیں۔" وہ بھن کر بولی۔

"واہ ..... واہ ..... کیا خوب لگے گی ہماری جوڑی۔ ایک کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔" علی نے اسے چھیڑا۔

"فضول ہی بولیں گے ہمیشہ۔" اس نے جل کر کہا۔

"آپ کی صحبت کا اثر ہے۔" علی بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا، جھٹ بول پڑا۔

"کیوں آ گئے یہاں آپ؟ وہاں بیٹھے بزرگوں کے پاس۔" زیب بیزاری سے بولی۔

"کیوں.....؟ آپ کو میرے یہاں بیٹھنے پر کیوں اعتراض ہے؟"

"اس لئے کہ جب سے آپ آئے ہیں مسلسل کان کھائے جا رہے ہیں۔" اس نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"تو کانوں میں رُوئی ٹھونس لیجئے محترمہ زیب النساء بیگم! کیونکہ میں اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔" وہ بڑے آرام سے مشورہ دے رہا تھا۔

"آپ نے پھر مجھے زیب النساء بیگم کہا۔" اسے تو گویا پتنگے لگ گئے۔

"ہاں..... اگر پسند نہیں ہے تو خیر النساء کہے دیتا ہوں۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔

"میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے صرف زیب کہا کریں۔" وہ غرائی۔

"سوری ..... مجھے آپ کا پورا نام لینا ہی پسند ہے اور میرے نزدیک میری پسند زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔" اس نے صاف لہجے میں کہا۔

وہ تلملا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عرشیہ نے بیچ بچاؤ کیا ورنہ ان سے کچھ بعید نہ تھی کہ آپس کی بحث باقاعدہ لڑائی کی صورت اختیار کر لیتی۔

"پلیز ..... پلیز ڈیئر کزنز! بند کریں یہ بحث۔" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر صلح کی جھنڈی دکھا دی۔

"مجھے کب عادت ہے بحث کرنے کی۔ انہی صاحب کو بولنے کا بہت شوق ہے۔" زیب منہ بنا کے بولی۔

"جی ہاں ..... اور آپ تو اتنی معصوم، نیک پروین ہیں کہ صرف سنتی ہی ہیں۔ منہ میں گویا زبان ہی نہیں۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

"یا اللہ! ..... ان دونوں کا اینٹ کتے کا بیر ہے ....." عرشیہ سر پکڑ کے اونچی آواز

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں بڑبڑائی۔

''توبہ توبہ..... کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ اپنی ہی دوست کو ''کتا'' کہہ رہی ہے۔ حد ہو گئی بدتمیزی کی۔'' علی بھلا کہاں چپ رہنے والا تھا۔ جھٹ سے عرشیہ کے بولے ہوئے محاورے کو اپنے ہی انداز میں لے لیا۔ اس کی بات پر عرشیہ نے تو اپنا سر پیٹ لیا اور زیب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''مائی گاڈ۔ علی بھائی! خدا کے لئے، کیوں ہماری اتنی پرانی دوستی میں دراڑ ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں؟ میں نے تو محاورتاً کہا تھا۔''

''اچھا تو تم نے محاورتاً اپنی سہیلی کو ''ڈیش'' کہا تھا۔ اب سمجھا۔'' علی سر ہلاتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولا۔

''کیوں لڑانا چاہتے ہیں ہم دونوں کو؟'' عرشیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

''بی جمالو کا کردار تو موصوف بخوبی نبھاتے ہیں۔'' زیب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''معاف کیجئے گا خاتون۔ بی جمالو موٹث ہیں، مذکر نہیں۔ لہٰذا یہ لفظ آپ پر زیادہ سوٹ کرتا ہے۔'' علی نے جھٹ قرض اتار دیا اور زیب خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

''اب میرا یہاں بیٹھنا ناممکن ہے۔'' وہ غصے میں بولی۔

''کیوں زیب النساء بیگم؟ کیا یہاں کھملوں کی فوج نے حملہ کر دیا ہے؟'' علی معصومیت سے بولا۔

''مائی گاڈ..... میں ایک لمحہ یہاں مزید ٹھہری تو میرا بی پی ہائی ہو جائے گا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

''ارے بیٹھو تم۔'' عرشیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''اور پلیز علی بھائی! اب آپ میری بہن کو تنگ نہ کریں اچھا۔'' عرشیہ نے اس سے کہا۔

''اجی ہم کب تنگ کر رہے ہیں آپ کی بہن کو؟ انہیں خود ہی ''مہا بھارت'' لڑنے کا شوق ہے۔'' علی بدستور اسے چھیڑنے میں مصروف تھا۔ اسے لطف بہت آتا تھا زیب کو زچ کرنے میں۔

چھوڑو میرا ہاتھ عرشی۔ میں ایک لمحہ یہاں نہیں رک سکتی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ہاں ہاں..... چھوڑ دو..... دشمنوں کا بی پی کہیں ہائی ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ

جائیں گے۔ خواہ مخواہ ڈاکٹروں کی فیس اور ہسپتال کا خرچہ۔ اتنا نقصان ہو جائے گا۔'' علی شوخی سے بولا۔

''فکر مت کریں..... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو کم از کم آپ سے ادھار نہیں مانگوں گی۔'' وہ تلملا کر بولی۔

''بے فکر رہیں۔ میں نے بھی ادھار دینا بند کر رکھا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا تو زیب اپنا ہاتھ چھڑا کے پیر پٹختی ہوئی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

''عرشی! دشمنوں سے کہو ذرا ہولے قدم رکھیں۔ فرش آہنی نہیں ہے۔ اگر گڑھے پڑ گئے تو خواہ مخواہ دادا جی کا خرچہ ہو جائے گا۔'' علی نے اونچی آواز میں بظاہر پاس بیٹھی عرشیہ کو مخاطب کیا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ چوٹ اسی پر کی گئی ہے۔

''ہنہ..... بدتمیز شخص۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

''ناراض کر دیا نا اسے۔ بہت برے ہیں آپ۔'' عرشیہ ناراضگی سے بولی۔ اسے زیب کے اس طرح روٹھ کے چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔

''کچھ لوگوں کو خواہ مخواہ روٹھنے کی عادت ہوتی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''جی نہیں..... آپ نے زیب کو جان بوجھ کر خفا کیا ہے۔'' عرشیہ نے اسے گھورا۔

''چلو ایسا ہی سمجھ لو۔ اب کوئی کیا کرے جب لوگ مذاق کی باتوں پر ناراض ہونے لگیں تو۔'' وہ بنوز مطمئن نظر آ رہا تھا۔ عرشیہ کچھ نہ بولی۔ علی نے نظریں گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہو جائے گی شام تک۔ دیکھنا تم چائے کے وقت یہیں موجود ہو گی۔ تم خوامخواہ اپنے ننھے سے ذہن کو پریشان نہ کرو۔''

''میں تو جا رہی ہوں اس کے پاس۔ آپ سے تو وہ خود ہی سمجھ لے گی۔'' عرشیہ، بھائی کو گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔ علی کچھ نہ بولا۔ بس مسکراتے ہوئے گوہر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

❋

عقیل احمد اپنے وقت کے نامی گرامی وکیل تھے۔ ایک زمانہ ان کے نام سے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

واقف تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہارا تھا۔ عزیز و رشتہ دار، دوست احباب سبھی ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ جلیل احمد، ان سے چھوٹے خلیل احمد اور سب سے چھوٹے طفیل احمد تھے۔ تینوں بیٹوں میں سے کسی نے بھی باپ کی لائن اختیار نہ کی۔

جلیل احمد نے اپنے لئے میڈیکل کی لائن کا انتخاب کیا تھا اور برین اسپیشلسٹ بن گئے تھے۔ خلیل احمد کا مزاج ذرا مختلف تھا۔ انہوں نے بزنس میں دلچسپی لی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کر دیا۔ طفیل احمد نے اپنے لئے انجینئرنگ کا شعبہ پسند کیا۔

عقیل احمد بچوں کے ساتھ زبردستی کے قائل نہیں تھے لہٰذا انہوں نے اس بات پر ذرا بھی اعتراض نہ کیا کہ ان تینوں بیٹوں میں سے کوئی ایک ہی وکالت کا شعبہ اپنا لے۔ انہوں نے تینوں بچوں کو بخوشی اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ اپنی دلچسپی کے مطابق اپنے لئے ذریعہ معاش اپنا لیں۔ ان کے تینوں بیٹے ہی لائق فائق تھے۔ پھر آگے ان کی اولاد بھی قابل نکلی۔

جلیل احمد کی تین اولادیں تھیں۔ علی سب سے بڑا بیٹا تھا اور اس نے اپنے لئے میڈیکل لائن ہی کا انتخاب کیا تھا۔ عرشی، علی سے چھوٹی تھی اور عرشیہ سے ایک سال چھوٹی عاصمہ تھی۔

خلیل احمد کی واحد اولاد زیب النساء تھی۔ جو کہ اکلوتے پن کی وجہ سے ماں باپ کی ہی نہیں بلکہ باقی سب کی بھی لاڈلی تھی۔ پھولوں کی طرح نرم و نازک اور کسی حد تک خود پسند و ضدی۔ زیب کی علی سے کبھی نہ بنتی تھی۔ علی اسے جان بوجھ کر چھیڑتا تھا اور وہ بھی علی کے ''بڑے پن'' کا لحاظ کئے بنا، اس سے ابھی طرح نمٹتی تھی۔

طفیل احمد کے تین بچے تھے۔ کامران سب سے بڑا تھا جو تقریباً علی ہی کا ہم عمر تھا۔ عثمان اور زوہیب اس سے چھوٹے تھے۔ سب کزنز کی آپس میں خوب بنتی تھی۔ ماسوائے علی اور زیب کے۔

عقیل احمد نے تینوں بچوں کی شادیوں سے قبل ''عقیل ہاؤس'' ہی میں ان کے لئے تین پورشن بنوا لئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی اولاد بڑی فرمانبردار ہے لیکن

اس بات کا بھی انہیں احساس تھا کہ شادی کے بعد اچھے خاصے فرمانبردار بچے بھی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ''عقیل ہاؤس'' کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے تینوں بیٹوں میں بانٹ دیا تھا تاکہ تینوں بیٹے ساتھ بھی رہیں اور آپس میں کوئی چپقلش بھی نہ ہونے پائے۔

ان کی حکمت عملی کام آئی اور جب تینوں بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں تو تینوں بہوؤں کو اپنے سسر اور ساس سے کوئی شکایت نہ ہوئی۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی، بہوؤں کے معاملات میں بے جا دخل اندازی نہ کرتے تھے۔ نہ ہی کوئی روک ٹوک تھی اور نہ روایتی ساس، سسر والا کردار سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں تو بس یہ چاہتے تھے کہ سب لوگ مل جل کر محبت سے رہیں۔ آپس میں کبھی نا اتفاقی پیدا نہ ہو۔ اسی لئے کبھی بھی فاطمہ اور عقیل احمد نے ان کے ذاتی معاملات میں بے جا مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی روایتی ساس کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ انہیں اپنی سگی بیٹیوں ہی کی طرح سمجھتی تھیں اور بہوئیں بھی اپنی ساس کی گرویدہ تھیں۔

یوں عقیل احمد کا یہ چھوٹا سا خاندان محبتوں اور مروتوں کی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ان کے بچوں میں بھی آپس میں بہت محبت اور اتفاق تھا، سوائے علی اور زیب کے۔ یہ دونوں جہاں اکٹھے بیٹھتے، وہیں ان کی تُو تُو، میں میں شروع ہو جاتی۔ علی، زیب سے بڑا تھا لیکن وہ بلا لحاظ اسے خوب ستاتی اور ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ جبکہ علی کو اس کی یہ عادت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ اس کو چڑانے کی غرض سے خوب تنگ کرتا۔ باتوں میں علی ہمیشہ اس کو مات دے دیتا تھا اور کبھی کبھی تو اتنا تنگ کرتا کہ وہ رو دیتی۔

کبھی کبھی جب دوسرے کزنز میں سے کوئی ان کی لڑائی بلکہ اس ''دشمنی'' کی وجہ پوچھتا تو علی بڑے اطمینان سے جواب دیتا۔ ''ہم سارے کزنز نہایت شریف اور بے ضرر قسم کے ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک کو تو ''جنگجو'' ہونا چاہئے نا۔ بس اپنی زیب النساء بیگم یہ کسر بھی پوری کئے دے رہی ہیں۔'' اور جو اگر زیب اپنا پورا نام سن لیتی تو اس سے برداشت نہ ہو پاتا۔ فوراً مقابلے میں آ جاتی۔

''میرا آپ کا کوئی مذاق نہیں ہے۔ پھر کیوں میرا پورا نام لیا؟'' وہ دھاڑتی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لو بھلا ..... میں نے کب کہا کہ میرا آپ کا مذاق ہے۔ نہیں ہے۔ تبھی تو ا۔ احترام سے پورا نام لیتا ہوں۔" وہ بڑی معصومیت سے کہتا اور زیب روہانسی ہو تائی امی سے شکایت کرنے چلی جاتی۔

"توبہ ہے ..... کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ مستقبل کے ڈاکٹر اور یہ بی۔ایس۔سی اسٹوڈنٹ ہیں۔" عرشیہ عاجز آ کر کہتی۔

"ہاں، ہاں ..... تم تو کہہ رہی ہو۔" علی جھٹ کہتا۔

شام کی چائے سبھی لوگ اکٹھے پیتے تھے۔

اس وقت بھی سب عقیل ہاؤس کے وسیع لان میں جمع تھے۔ بزرگ خواتین اور حضرات الگ ٹولا بنائے گپ شپ میں معروف تھے۔ جبکہ نوجوان ٹولا علیحدہ سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ چائے کے ساتھ ساتھ مزیدار سنیکس کا دور بھی چل رہا تھا کہ بوا کریمن نے فون کی اطلاع دی۔

"کس کا فون ہے؟" زیب نے پوچھا۔

"ارے وہ اپنی خالہ تہذیب ہیں نا۔ ان کا پھون (فون) آیا ہے۔" بوا کریمن نے بتایا۔

"خالہ تہذیب کا فون .....؟ انہوں نے کیسے کر لیا فون؟" تائی امی نے خود کلامی کی۔ "میں ذرا فون سن لوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

خالہ تہذیب، عقیل احمد کی دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ عقیل احمد کی والدہ سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اور اب عقیل احمد اور ان کے گھرانے سے بھی بہت بنتی تھی۔ وہ سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور چاہتے بھی بہت تھے۔ سوائے زیب کے۔ اس کو ان سے خاصی چڑ تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کے بے تحاشا پان کھانے کی عادت سے چڑ تھی اور زیب کو پان کے نام سے ہی نفرت تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ زیب کا پورا نام لیتی تھیں اور زیب کا نام جو شخص پورا لیتا وہ اس کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ کالج وغیرہ میں بھی وہ اپنے اساتذہ اور دوستوں میں زیب مشہور تھی۔ اس کا پورا نام تو بہت کم لوگ جانتے تھے۔

خالہ تہذیب پشاور میں رہتی تھیں۔ وہاں ان کی قدیم طرز کی بڑی سی حویلی تھی

جہاں وہ اپنے دو عدد پرانے ملازموں اور ایک بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ باقی ساری اولادیں تو پڑھ لکھ کر شادی کے بعد اپنے اپنے روزگار کی تلاش میں مختلف شہروں میں آباد ہو گئی تھیں۔ بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں کی ہو گئی تھیں۔ بس یہی ایک بیٹا تھا جو ان کے پاس تھا۔ فضل دین کام کاج نہ کرتا تھا، بس بے کار سارا دن گھر میں ہی رہتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جس کی وہ شادی کر چکا تھا۔ اب بس اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا اور جمع پونجی کھا رہا تھا۔

خالہ عقیل ہاؤس بہت کم آتی تھیں۔ اسی لئے ان کی آمد پر ان لوگوں کو خوشی ہوتی تھی۔ تائی اماں کے آنے تک خالہ ہی موضوع گفتگو بنی رہیں۔

"وہ آ رہی ہیں۔" انہوں نے واپس آتے ہی اطلاع دی۔

"ہیں ..... سچ ..... کب .....؟" علی جلی آوازوں نے سوال کیا۔

"کل پہنچیں گی۔" انہوں نے بتایا۔

"مبارک ہو ..... دشمنوں کی چہیتی خالہ آ رہی ہیں۔" علی کی شوخ آواز پر زیب نے اسے گھورا۔

"کس وقت آ رہی ہیں وہ؟" علی نے اس کے گھورنے کی پرواہ کئے بغیر پوچھا۔

"یہی، چار پانچ بجے۔" انہوں نے بتایا۔ "بشرطیکہ ٹرین وقت پر پہنچے۔"

"ہاں بھئی ..... ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہے۔ وقت پر پہنچتی ہی نہیں ہے ٹرین۔" سلمٰی بولیں۔

"فکر نہ کریں آپ۔ خالہ کی ٹرین یقیناً وقت پر ہی پہنچے گی۔" علی اطمینان سے پُریقین لہجے میں بولا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو میاں؟" سلمٰی نے مسکرا کے پوچھا۔

"وہ اس لئے کہ یہاں ان کے بڑے بڑے قدر دان اور چاہنے والے زور و شور سے ان کی ٹرین کے وقت پر پہنچنے کی دعائیں کر رہے ہیں۔" اس نے کن انکھیوں سے زیب کو دیکھا۔

"تائی امی! انہیں منع کریں۔ مجھ سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا کریں۔" وہ بھنا کر ان سے شکایت کرنے لگی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہیں، ہیں..... قسم کھائیے امی جان کہ میں نے ان محترمہ سے کچھ کہا بھی ہو۔ میں تو اپنی پیاری پیاری چچی جان سے مخاطب تھا۔ فضول الزام لگا رہی ہیں۔" علی نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔

"توبہ ہے..... تم دونوں ہر وقت بچوں کی طرح جھگڑتے رہتے ہو۔" تائی امار نے کہا۔

"امی! قسم سے میں تو آپ کا بڑا پیارا بچہ ہوں۔ ہاں البتہ "دوسروں" کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ شوخی سے بولا۔ "کیوں بڑی چچی! آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ جھٹ خالدہ سے مخاطب ہوا۔

"جی جی..... بالکل..... آپ جیسے دس بارہ اور "بی بے بچے" پیدا ہو جائیں تو دنیا میں کوئی "ہاں ہاں بچہ" ہی نہ رہے۔" زیب طنزیہ انداز میں بولی۔

"اسی لئے تو مزید بی بے بچے پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں کہ کسی کو تو "ہاں ہاں" بھی ہونا چاہئے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

"بھئی تم لوگ کیا قصہ لے بیٹھے۔ بات تو خالہ تہذیب کی ہو رہی تھی۔" خالدہ نے اکتا کر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں..... تو دوبارہ شروع کرتے ہیں جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا۔" علی نے سر ہلایا۔

"یہ بتائیے کہ انہیں لینے کون جائے گا؟" عثمان نے پوچھا۔

"بھئی اصولاً تو انہیں جانا چاہئے جو جھولیاں پھیلا پھیلا کر خالہ کی آمد کی دعائیں کرتے رہے ہیں۔" علی پھر بول پڑا۔ زیب نے تلملا کر اسے دیکھا۔

"تو پھر تو آپ کو ہی جانا چاہئے نا۔" وہ جل کے بولی۔

"نہ، نہ بھئی..... تمہارے ہوتے ہوئے مجھے زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"تم دونوں پھر مت لڑنے لگنا پلیز۔ خالہ کو لینے میں چلا جاؤں گا۔" عثمان نے جلدی سے کہا کہ کہیں ان کی بحث لمبی ہی نہ ہو جائے۔"

"ں تو ٹھیک ہے..... طے ہو گیا..... تم اور کامران چلے جانا۔" سلمٰی نے کہا۔

وہ بے خبر سو رہی تھی کہ کسی کے جھنجھوڑنے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بڑی ناگوار نظروں سے اس نے دیکھا تو عرشیہ کھڑی تھی۔

"کیا افتاد آن پڑی ہے..... کیوں پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو؟" اس نے غصے میں کہا۔

"تمہارے لئے تو سمجھو افتاد ہی آن پڑی ہے۔" عرشیہ دھم سے اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کیا مطلب؟" زیب نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"خالہ تہذیب آ گئی ہیں۔" اس نے اطلاع دی تو زیب کی شفاف پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"دفعان ہو جاؤ..... یہ فضول خبر سنانے کے لئے میری نیند خراب کی ہے؟" زیب نے تکیہ اٹھا کر اس پر دے مارا۔ اپنی نیند خراب ہو جانے کا اسے افسوس ہو رہا تھا۔

"پوری بات تو سن لو۔" عرشیہ نے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"بکو۔"

"خالہ کے ساتھ ایک عدد خانہ بدوش بھی تشریف لائی ہیں۔" اس نے اپنی طرف سے تجسس پیدا کرنا چاہا لیکن ادھر کوئی خاص ردِعمل نہ تھا۔

"تو میں کیا کروں؟" بڑی بیزاری سے جواب ملا۔

"یار! وہ لڑکی نہیں ہے....." عرشیہ نے کہنا چاہا۔

"تو کیا بھتنی ہے؟" زیب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔

"اسٹوپڈ! وہ لڑکی نہیں ہے۔ کسی شاعر کی غزل لگتی ہے۔ ایسا مکمل اور مبہوت کر دینے والا حسن آج سے قبل میری نظروں کے سامنے سے نہیں گزرا۔ بہت ہی کیوٹ لڑکی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"چلو تم کو ملواتی ہوں اس سے۔" عرشیہ نے اس پر سے کمبل ہٹاتے ہوئے کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مجھے نہیں ملنا ہے کسی سے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔

"خبردار جو اب نیند کا نام بھی لیا تو۔ اٹھو اور چلو۔ سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ اور خالہ کوئی پچاس مرتبہ تمہارا پوچھ چکی ہیں۔" عرشیہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز عرشی! بور مت کرو..... میں ابھی سونے کے موڈ میں ہوں۔ جب نیند پوری ہو جائے گی تب آ جاؤں گی..... ابھی تو معاف ہی رکھو۔" زیب اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے..... مرو یہیں۔ بات مت کرنا مجھ سے کبھی۔" عرشیہ نے اس کا بازو ایک جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے کہا اور خفا خفا سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر منہ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"افوہ..... ایک تو تم ناراض بہت جلدی ہو جاتی ہو۔ اچھا بابا اچھا..... اٹھتی ہوں۔ اب اپنے منہ کا جغرافیہ درست کرو۔" زیب بادل نخواستہ اٹھتی ہوئی بولی تو عرشیہ نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

"پکی بلیک میلر ہو تم۔" زیب پیار سے اسے گھورتی ہوئی واش روم میں گھس گئی اور عرشیہ مسکراتی ہوئی کمبل تہہ کرنے لگی۔ جانتی تھی کہ وہ اس کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی۔

منہ ہاتھ دھوتے ہوئے زیب نے صرف ایک مرتبہ اس اجنبی، ان دیکھی لڑکی کے متعلق سوچا جس سے ملوانے کے لئے عرشیہ اتنی بے تاب ہو رہی تھی۔ اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد وہ دونوں عقیل ہاؤس کے وسیع ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔

"ماشاء اللہ..... بھئی یہاں تو اچھا خاصا میلہ لگا ہوا ہے۔" اندر داخل ہوتے ہوئے زیب نے عرشیہ سے کہا۔

یہاں کا تو منظر ہی آج نرالا تھا۔ سامنے صوفے پر خالہ تہذیب بڑی شان سے براجمان تھیں۔ ان کے دائیں طرف دادی بیٹھی تھیں اور بائیں جانب ایک بے حد حسین و جمیل دوشیزہ بڑے پُر وقار انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے ہلکے سے بادامی رنگ

کا کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بڑا سا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے وہ کسی بات پر ہولے سے مسکرا رہی تھی اور مسکراتے ہوئے وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی معصوم فرشتہ۔ اس کے نین نقش بے حد تیکھے اور خوبصورت تھے۔ رنگت جیسے دودھ میں سندور گھلا ہو۔ اس کے دائیں رخسار پر ایک سیاہ تل اس کے حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ یوں تو وہ پرستان کی بھولی بھٹکی کوئی پری ہی لگ رہی تھی لیکن اس کے ماورائی حُسن کی شان شاید اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں..... جیسے کوئی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ ایسی گہرائی تھی ان میں کہ بندہ ایک بار جھانکنے کی غلطی کر بیٹھے تو سمجھو ڈوب گیا۔ چمک ایسی تھی جیسے کسی نے بے شمار ہیرے کوٹ کوٹ کر ان میں بھر دیئے ہوں۔ ان دو پراسرار، حسین آنکھوں پر گھنی پلکوں کی سیاہ باڑ جیسے قدرت نے حفاظت کے طور پر باندھ دی ہو۔ اس کے بالوں کا رنگ سرخی مائل تھا اور ان میں بھی چمک تھی۔ ایسا بے داغ حُسن، ایسی موتی کی طرح شفاف جلد، اسے عرشیہ کی باتوں پر ایمان لانا ہی پڑا جو اس لڑکی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔ اس کے کمرے سے ڈرائنگ روم تک کے راستے کو طے کرنے کے دوران اس کا دماغ چاٹ گئی تھی کہ وہ لڑکی ایسی ہے، وہ لڑکی ویسی ہے۔ وہ بات کرے تو یوں لگتا ہے، وہ نظر اٹھا کے دیکھے تو ویسا لگتا ہے۔ اور اس کی تعریفوں سے عاجز آ کر زیب نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"نہ کرو ایسی باتیں..... مبالغہ لگتی ہیں۔" زیب چڑ کر بولی تھی۔

"مبالغہ آرائی نہیں کر رہی ہوں۔ خود ہی دیکھ لینا۔ پھر لگے گا پتہ کہ میں سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ۔" وہ بڑے پُر یقین اور مضبوط لہجے میں جواب دینے لگی۔

"چلو..... دیکھ ہی لیں گے۔" زیب نخوت سے بولی تھی۔

"کہو، کیا کہا تھا میں نے؟" عرشیہ نے ٹہوکا دیتے ہوئے سرگوشی کی تو وہ چونکی۔

"ٹھیک ہے..... اچھی ہے..... مگر ویسی بھی نہیں جیسی تم نے تعریف کی تھی۔" اسے چڑانے کی غرض سے وہ بڑی بے نیازی سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور عرشیہ آنکھیں پٹپٹائے اسے دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ زیب اس لڑکی کے حسن سے ذرا بھی متاثر نظر نہ آ رہی تھی۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ زیب نے ایسا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

حسین چہرہ، دلکش روپ اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اور ایسے قیامت خیز حُسن سے متاثر نہ ہونا تو بس شیطان ہی کا کام ہو سکتا تھا۔

"آداب خالہ!" خالہ تہذیب کی جانب بڑھتی زیب نے دور ہی سے آداب کر دیا۔ خالہ اس کی آواز پر چونکیں، ساتھ ہی وہ پری وش بھی جواب زیب کی طرف متوجہ تھی۔

"اے زیب النساء بیٹا! ماشاء اللہ، جیتی رہو۔ اے میرے پاس تو آ بچی۔ آنکھیں ترس گئی تھیں اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے...... آؤ، پیار تو کروں اپنی گڑیا کو۔ کتنے عرصے بعد دیکھ رہی ہوں۔" وہ محبت میں بازو پھیلائے کہہ رہی تھیں اور عرشیہ سمیت سبھی کزنز شوخی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ علی وہاں موجود نہ تھا ورنہ ضرور فضول کرتا۔ زیب نے صرف سر آگے کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ مگر خالہ نے اس کے سر کے ساتھ ساتھ اس کے رخسار بھی چوم لئے۔

"ماشاء اللہ...... بھئی خالدہ! تمہاری بیٹی نے خوب رنگ روپ نکالا ہے۔ اے بچی بات کہتی ہوں، کیسا نکھرا نکھرا حُسن ہے۔ اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔ بچی کی نظر وظر اتارتی رہا کرو۔" خالہ توصیفی نظروں سے زیب کو دیکھتے ہوئے خالدہ سے کہہ رہی تھیں۔

"خالہ جی! مت چڑھائیں انہیں اتنا۔ پہلے ہی ساتویں آسمان پر رہتا ہے دماغ۔" کامران جھٹ بولا۔

"کیوں جلتے ہو میری تعریف سے؟" زیب نے کامران کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"نہ جی...... خدا نہ کرے، میں کیوں جلنے لگا آپ سے۔ جلنے کے لئے تو آپ کے "دشمن" ہی بہت ہیں۔" کامران کا اشارہ علی کی طرف تھا۔

"میرے بھائی کو حاسد بنا دیا...... کیسے دوست ہو تم۔ آنے دو ذرا بھائی کو۔ بتاؤں گی انہیں کہ پیچھے آپ کا یہ دشمن نما دوست آپ کی برائی کرتا ہے۔" عاصمہ سے بھلا کب بھائی کی برائی جو اسے برداشت نہ ہوئی تھی۔

"توبہ توبہ! ایسی شکایتی ٹٹو قسم کی کزن ہے میری۔" کامران منہ بنا کے بولا۔

"تو کیوں کرتے ہو ایسی حرکتیں؟" عرشیہ مسکرائی۔

"توبہ ہے میری۔ آئندہ جو تم لوگوں کے سامنے کسی کی برائی کروں۔" کامران نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو عرشیہ مسکرا کر عاصمہ کو دیکھنے لگی۔

"چلیں معاف کیا...... کیا یاد کریں گے۔" عاصمہ نے حاتم کی قبر پر لات ماری۔

"شکریہ ملکہ عالیہ۔" کامران دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے عاجزی سے سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"ماشاء اللہ...... خوب رونق لگاتے ہیں یہ بچے۔ خدا ان سب کی قسمتیں اچھی کرے۔" خالہ مسکراتے ہوئے دادی سے کہہ رہی تھیں۔

"آمین۔" سب لڑکے لڑکیاں یک زبان ہو کر بولے۔

"ان کا تعارف تو کرایا ہی نہیں آپ نے۔" زیب نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو بڑی دلچسپی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔

"ارے ہاں۔ دیکھو تو ذرا، میں تو بھول ہی گئی تھی چندن کا تعارف کرانا۔" خالہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔ "یہ میری نواسی ہے چندن۔ اس کی ماں کو اپنی بیٹی بنایا ہوا ہے میں نے۔" خالہ نے تعارف کرایا۔

"ہیلو...... نائس ٹو میٹ یو۔" زیب نے چندن کی طرف اپنا نازک سا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سیم ٹو۔" چندن جواباً مسکرا کر بولی اور زیب کو لگا جیسے اس کے اردگرد کانچ کی مترنم گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ کیسی جادو بھری آواز تھی۔

"خالہ! آپ تھک گئی ہوں گی۔ چل کر کچھ دیر آرام کر لیجئے۔ بچی بھی ذرا دیر کو سستا لے گی۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہے۔" تائی اماں کو اتنے لمبے سفر کی تکان کا اندازہ تھا، تبھی تو بولیں۔

"ہاں بچی! میں تو واقعی تھک گئی ہوں۔ موئی سیٹ پر بیٹھنا بھی ایک عذاب ہے۔ حالانکہ اس بچی چندن نے اپنی برتھ بھی مجھے پیش کر دی تھی کہ خالہ! آپ آرام کریں یہاں اور خود بے چاری سیٹ پر ہی دن رات بیٹھی رہی تھی۔ مگر پھر بھی کمر تختہ ہو رہی ہے۔" خالہ بولیں۔

"واقعی یہ ٹرین کا سفر بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔" سلمیٰ چچی سر ہلاتے ہوئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بولیں۔

''چلیں خالہ! میں آپ کو آپ کے کمرے تک لے جاؤں۔'' تائی امی نے ان سے کہا۔ پھر وہ عرشیہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''عرشی! تم بہن کو اس کا کمرا دکھا دو۔ اور دیکھنا سب ضرورت کی چیزیں پوری ہیں نا۔''

''جی امی..... میں نے خود ساری چیزیں رکھی تھیں۔ سب موجود ہے۔'' عرشیہ نے جواب دیا۔

''جاؤ بیٹی! عرشیہ کے ساتھ چلی جاؤ۔'' وہ اب اس سے مخاطب تھیں۔

''جی..... شکریہ۔'' چندن اٹھتے ہوئے بولی۔

''چلو زیب تم بھی۔'' عرشیہ نے زیب سے کہا جو بڑی گہری نظروں سے چندن کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں..... تم جاؤ۔'' اس نے انکار کر دیا تو عرشیہ نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چندن کو لئے کمرے سے باہر نکل گئی اور تائی امی، خالہ کو ساتھ لے کر ان کے مخصوص کمرے کی طرف چل دیں جہاں خالہ ہمیشہ ٹھہرا کرتی تھیں۔

''یہ محترمہ کون تھیں؟'' زیب نے ان کے جاتے ہی ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''خالہ نے بتایا تو تھا، ان کی منہ بولی نواسی ہے۔'' خالدہ بولیں۔

''میرا مطلب ہے کہ یہ نواسی صاحبہ ہمارے ہاں کیا کرنے آئی ہیں؟'' وہ چندن کی آمد کا راز جاننا چاہ رہی تھی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ چندن کی ماں کو برین ٹیومر ہے۔ پشاور میں وہ علاج تو کروا رہی تھیں مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اور اب جبکہ معاملہ ذرا سیریس ہو گیا ہے تو جس ڈاکٹر کے زیر علاج وہ رہی ہیں انہوں نے تمہارے تایا جان سے علاج کرانے کا مشورہ دیا ہے۔ تم کو تو معلوم ہے کہ تمہارے تایا کا شمار ملک کے چند نامی گرامی برین اسپیشلسٹس میں ہوتا ہے۔ خالہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے چندن سے اپنی اور بھائی صاحب (جلیل احمد) کی رشتہ داری ظاہر کر دی اور اس سے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ خود چندن کو تمہارے تایا سے ملوائیں گی۔ لہٰذا اب وہ چندن کو لے کر یہاں

اسی مقصد سے آئی ہیں۔ اب چندن یہاں تمہارے تایا جان سے اپنی والدہ کا معاملہ ڈسکس کرے گی۔ پھر دیکھو، بھائی صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔'' وہ چندن کی آمد کا مدعا تفصیلاً بیان کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' چندن کی آمد کی تفصیل سن کر وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

❁

چندن کی آمد چونکہ غیر متوقع تھی لہٰذا جیسے ہی وہ عقیل ہاؤس میں آئی تھی تائی امی نے عرشیہ سے کہہ کر اس کے لئے کمرا ٹھیک کروا لیا تھا۔ چندن کو ساتھ لئے وہ اوپری منزل پر آ گئی جو کہ ان کا پورشن تھا۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ وا کیا اور چندن کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''کہئے..... کیسا لگا آپ کو آپ کا رُوم؟'' کمرے میں آتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ''ویسے اگر آپ کی آمد کی اطلاع پہلے مل جاتی تو یقیناً اس سے زیادہ اچھا انتظام کر لیتی۔ لیکن خالہ نے تو آپ کی آمد کو راز ہی رکھا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

چندن نے ایک نظر پورے کمرے پر ڈالی۔ کمرا زیادہ بڑا نہ تھا۔ لیکن بڑی نفاست اور خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ دیواروں پر آف وائٹ پینٹ کیا گیا تھا۔ پردوں، کارپٹ، بیڈ شیٹ اور صوفے کا رنگ چاکلیٹی تھا۔ سامنے کی دیوار پر بہت خوبصورت سینری آویزاں تھی۔ ایک دیوار پر وال کلاک لگا تھا۔ کارنس پر نیلے رنگ کے بلور کے گلدان میں نرگس کے پھول سجے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

''کیوں..... کیسا ہے..... کوئی خرابی تو نہیں ہے؟''

''بہت اچھا ہے..... اور یہ نرگس کے پھول تو بے حد خوبصورت ہیں۔'' چندن نے پھولوں کے قریب آتے ہوئے بڑی نرمی سے انہیں چھوا۔

''تھینکس، آپ کو پسند آ گئے۔ آپ کو پتہ ہے یہ پھول میں بھائی کے کمرے سے چرا کر لائی ہوں۔ بڑے شوقین ہیں وہ پھولوں کے۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

''چرا کے.....؟'' چندن نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''دراصل بھائی کو نرگس کے پھول بہت پسند ہیں۔ ہمیشہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے لے آتے ہیں۔ آج ہی لائے تھے کہ اپنے کمرے کی زینت بنائیں گے مگر میں نے سوچا کہ چلو اس بار انہیں نرگس کے پھولوں جیسے نرم و نازک مہمان کے کمرے کی زینت بنا دیا جائے۔ سو میں ان کے کمرے سے لے آئی۔'' وہ بتا رہی تھی۔

''مگر یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا..... اگر آپ کے بھائی کو پتہ چلا تو ناراض ہوں گے۔''

''میں خود ہی بتا دوں گی انہیں۔ وہ خفا نہیں ہوتے ہیں بالکل بھی۔ اگر وہ صبح ہی گھر میں موجود ہوتے تو میں ضرور ان سے پوچھ کر یہ کام کرتی۔ لیکن وہ تو ناشتہ کرنے کے بعد ہی اشعر بھائی کے ہاں چلے گئے تھے۔'' عرشیہ بڑی سادگی سے کہہ رہی تھی۔

''ویسے آپ کو پھول پسند ہیں؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''بے حد..... عشق ہے مجھے ان سے۔ لیکن.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''لیکن کیا.....؟'' عرشیہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

''ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ کھلتے بھی جلدی ہیں اور مرجھا بھی جلدی جاتے ہیں۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

''ہاں..... یہ تو ہے۔ مگر جو بھی چند دنوں کی ان کی زندگی ہوتی ہے، یہ اس میں بھی دوسروں کو خوشیاں ہی بخشتے ہیں۔'' عرشیہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

''وہ کیسے.....؟'' چندن نے اشتیاق سے اس معصوم سی پیاری لڑکی کو دیکھا۔

''وہ ایسے کہ یہ کسی کی سیج پر سجتے ہیں۔ کسی کے گلے کا ہار بنتے ہیں اور.....''

''اور کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں کہ یہ کسی کی قبر پر چڑھائے جاتے ہیں۔'' چندن نے اس کی بات کاٹ کر افسردگی سے کہا تو لمحہ بھر کو عرشیہ چپ ہو گئی۔

''تو پھر یوں کہنا چاہئے کہ یہ خوشی اور غمی دونوں کی غمازی کرتے ہیں۔'' عرشیہ بولی تو چندن افسردگی سے مسکرائی۔

''آپ کے گھر کے لان میں، میں نے بہت خوبصورت پھول دیکھے ہیں۔ لگتا ہے پھولوں سے بہت پیار ہے آپ لوگوں کو۔'' وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

''ہاں..... ویسے تو سبھی کو پھول اچھے لگتے ہیں۔ مگر زیب اور بھائی دونوں دیوانے ہیں پھولوں کے۔''

''زیب آپ کی وہ کزن ہے شاید جن سے ابھی ابھی ملاقات ہوئی تھی۔''

''شاید نہیں، یقیناً۔'' عرشیہ پھر ہنسی۔ ''بھائی تو اس حد تک چاہتے ہیں پھولوں کو کہ ان کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ میرے بچے ہیں۔ میڈیکل کر رہے ہیں لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح کچھ وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ زیب اگر کبھی کبھار ان کے لگائے ہوئے پھولوں میں سے کوئی پھول توڑ لے تو بھونچال آ جاتا ہے گھر میں۔ خوب لڑتے ہیں اس سے۔''

''اچھا.....'' چندن بیڈ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''ارے آپ تو بہت تھکی ہوں گی۔ میں کیسی پاگل ہوں، باتیں کرنے بیٹھ گئی آپ سے۔'' اچانک ہی باتوں کے دوران اسے خیال آیا تو بولی۔ ''اب ایسا کریں کہ آپ باتھ لے لیں۔ فریش ہو جائیں گی۔ پھر کچھ دیر آرام کر لیں۔ باتھ روم میں تولیہ وغیرہ سب موجود ہے۔ اگر کوئی سوٹ پریس کرانا ہو تو مجھے دے دیں۔'' عرشیہ نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ..... میرے سب کپڑے استری شدہ ہیں۔'' چندن نے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے..... یہ ساتھ والا کمرا میرا ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دیں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے کو مڑی۔ ''ہاں..... ایک بات اور۔'' نجانے کیا بات اسے یاد آ گئی تھی جو وہ واپس پلٹی۔ چندن سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تکلفات مجھ کو ہضم نہیں ہوتے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو تم کہہ کر مخاطب کر سکتی ہوں؟'' وہ جھجکتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور چندن اس کی معصومیت پر مسکرا دی۔

''اوہ شیور..... کیوں نہیں؟''

''تھینکس۔ اچھا تو پھر تم فریش ہو جاؤ اور آرام کرو۔ میں ذرا کچن میں جھانک آؤں۔ شاید میری مدد کی وہاں ضرورت ہو۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

چندن نے اٹھ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور اپنا سامان واحد یعنی ایک سفری بیگ (جو کہ ملازم پہلے ہی کمرے میں رکھ گیا تھا) میں سے ایک سوٹ نکالا اور بیگ کو بند کر کے باتھ روم میں گھس گئی۔

کافی دیر نہانے کے بعد تازہ دم ہو کر وہ گیلے اور گیلے بالوں کو ہولے ہولے تولیے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے رگڑ رگڑ کر خشک کرنے لگی۔ اس کے بال گھٹنوں سے بھی لمبے اور بے حد گھنے تھے۔ انہیں دھونا اور سلجھانا بھی ایک عذاب ہی لگتا تھا۔ مگر اس وقت سر دھونا اس لئے بھی ضروری تھا کہ راستے بھر جو میل کچیل، دھول، مٹی اس کے سر پر جمی تھی ان سے نجات مل سکے۔ گیلا تولیہ کرسی کی پشت پر ڈالنے کے بعد اس نے مرے کی ساری بتیاں آف کر دیں اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ ٹرین کے سفر کی وہ بالکل بھی عادی نہ تھی۔ لہٰذا اس قدر تھکن محسوس کر رہی تھی کہ بستر پر دراز ہونے کے چند لمحوں کے بعد ہی خود بخود اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ اسے پتہ ہی نہ چلا، نجانے کب تک وہ یونہی ایک ہی کروٹ پر سوتی رہی تھی جب اچانک ہی ٹھک ٹھک کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

چند لمحوں تک تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ حالت شعور میں آئی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس وقت وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں ہے بلکہ کسی کے ہاں بطور مہمان ٹھہری ہوئی ہے اور یہ ٹھک ٹھک کی آوازیں دروازے پر دستک کے نتیجے میں پیدا ہو رہی ہیں۔

اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ روشن کیا اور دوپٹہ کندھے پر رکھے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلتے ہی عرشیہ کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے آ گیا جو کہ دوستانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"کافی گہری نیند سوئی تھیں تم۔ میں دو بار آ کے پلٹ چکی ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں ...... دراصل میں کافی تھک گئی تھی۔ دو راتوں سے نیند بھی نہیں کی تھی نا۔" وہ جماہی لیتے ہوئے بولی اور ساتھ ہی وال کلاک پر نگاہ ڈالی جو آٹھ بجا رہا تھا۔

"لگتا ہے تم کو ٹرین کے سفر کی عادت نہیں ہے۔" عرشیہ پوچھنے لگی۔

"ہاں ...... بالکل بھی نہیں۔ یہ تو نانی کی وجہ سے پہلی مرتبہ ایسے سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ دراصل میں ہمیشہ پلین ہی میں سفر کرتی ہوں۔ نانی سے کہا بھی تھا کہ پلین سے چلتے ہیں، آرام سے پہنچ جائیں گے اور تھکان بھی نہیں ہو گی۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگیں، مر جاؤں گی مگر جہاز میں نہیں بیٹھوں گی۔ اب کوئی پوچھے تو ان

سے کہ بھلا اس میں اتنا ڈرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سارے لوگ تو کرتے ہیں سفر۔ آپ کو پلین کے اندر سیٹوں پر بٹھایا جائے گا۔ نہ کہ پلین کے اوپر۔"

عرشیہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

"صحیح کہا تم نے۔ وہ کبھی بھی پلین کا سفر نہیں کرتیں۔ امی بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے کسی پلین کے کریش ہونے کا منظر دیکھ لیا تھا اپنی آنکھوں سے۔ بس تب سے وہ ہوائی سفر کے نام سے بھی ڈرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ زمینی سفر میں اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو کم از کم انسان کی لاش تو مل ہی جاتی ہے۔ لیکن ہوائی سفر کے حادثے میں تو ٹکڑے ملنے بھی مشکل ہو جاتے ہیں۔" عرشیہ نے ان کے خوف کی وجہ بتائی۔

"اوہ ...... تبھی تو۔" چندن نے سر ہلا دیا۔

"چائے کا موڈ ہے؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں ...... " چندن نے سر ہلا دیا۔ "نانی کہاں ہیں؟"

"وہ نیچے بیٹھی ہیں، دادی کے پاس۔"

"اچھا تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ میں ذرا اپنے بال ٹھیک کر لوں۔" چندن یہ کہہ کر اپنے بالوں میں آہستہ آہستہ برش پھیرنے لگی۔

عرشیہ نے دیکھا، جتنی حسین وہ خود تھی اتنے ہی حسین اس کے بال بھی تھے۔ سرخی مائل، بے حد چمک دار، ریشم کے لچھوں جیسے لہر دار بال۔

"تمہارا آدھا حُسن تو تمہارے بالوں میں پنہاں ہے۔" عرشیہ بنا تعریف کئے نہ رہ سکی۔

"شکریہ ......" چندن اداسی سے مسکرائی۔

"مجھے لمبے بال بے حد پسند ہیں۔ لیکن افسوس کہ میرے اپنے بال اتنے کم ہیں کہ مٹھی میں بھی نہیں آتے۔ بڑے ٹوٹکے آزمائے لیکن یہ کمبخت بڑھتے ہی نہیں۔ جبکہ بھائی بھی ڈانٹتے ہیں کہ میں کیوں اپنے بال کٹوا دیتی ہوں۔ لمبے کیوں نہیں کرتی۔ اور میں سو مرتبہ انہیں بتا چکی ہوں کہ میرے بال بڑھتے ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ تم کیا آزماتی ہو؟" عرشیہ بالوں کی ننھی منی پونی ٹیل کو چھوتے ہوئے بڑی بے چارگی اور حسرت سے پوچھ رہی تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کچھ بھی نہیں ..... بس یوں سمجھو قدرت کا تحفہ ہیں۔" چندن مسکرائی اور بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے عرشیہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

جس وقت وہ عرشیہ کے سنگ چلتی ہوئی بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو یہاں اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگی بولیاں بولی جا رہی تھیں۔ اچھی خاصی رونق تھی۔

"آؤ بیٹے..... یہاں آ جاؤ۔" تائی امی نے اسے دیکھتے ہی کہا اور اپنے پاس ہی اس کے لئے جگہ بنا لی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی جبکہ عرشیہ فلور کشن پر ذرا سا ہٹ کے بیٹھ گئی۔

"بڑی دیر تک سوئیں ..... تھک گئی تھیں.....؟" خالہ شفقت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"جی....." اس نے سر ہلا دیا۔

"اس بے چاری کو تو ٹرین کے سفر کی عادت ہی نہیں ہے۔ صدقے جاؤں اپنی بچی کے، میری وجہ سے اتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔" خالہ، دادی سے کہہ رہی تھیں۔

"کیوں شرمندہ کرتی ہیں نانی! تکلیف تو آپ کو میری وجہ سے سہنی پڑی۔ اس عمر میں آپ کے لئے اتنا لمبا سفر واقعی تکلیف کا باعث بنا ہوگا۔" وہ محبت سے بولی۔

"چلیں مان لیا کہ آپ دونوں نے ایک دوسرے کے لئے تکلیفیں جھیلیں۔ یعنی دونوں میں مروت و لحاظ کی وافر مقدار پائی جاتی ہے۔" کامران نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم میں مروت بالکل نہیں ہے۔" خالہ بولیں۔

"کیوں، کیوں بھلا..... ذرا وضاحت تو فرمائیں۔" کامران اس "الزام" پر بلبلا اٹھا۔

"وہ اس طرح بچے! کہ یاد بھی ہے کہ تم پشاور کب گیا تھا آخری مرتبہ؟"

اور خالہ کے سوال پر وہ شہادت کی انگلی گال پر رکھے سر ہائیں جانب جھکائے سوچ میں پڑ گیا۔

"میں بتاتی ہوں خالہ۔ یہ پانچ سال پہلے گیا تھا۔" عرشیہ کی یادداشت اچھی تھی،

اس نے جھٹ بتا دیا۔

"ہاں ..... اور اس عرصے میں نہ تو اس بے مروت نے فون پر بڈھی خالہ کا حال پوچھا اور نہ ہی خط لکھنے کی زحمت کی۔ ملنا تو دور کی بات ہے۔ حالانکہ سارے ہی بچے سوائے تیرے اور زیب النساء بیٹی کے میرا حال احوال پوچھتے رہتے ہیں وقتاً فوقتاً۔" خالہ نے گلہ کیا۔

"ارے دیر سویر سوری میری پیاری خالہ جان۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے لمبے سفر سے پرہیز بتایا ہے۔ یہ تھی میری پرابلم۔ باقی رہا سوال زیب کے نہ آنے کا تو یہ آپ اسی سے پوچھیں۔" کامران نے شوخی سے کہا۔

"رہنے دو ..... سب سمجھتی ہوں میں۔ بڈھی خالہ کے ہاں دل نہیں لگتا نا۔" خالہ نے مکھی اُڑانے کے سے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو خالہ جی! کم از کم جی بہلانے کے سامان تو رکھ لیا کریں۔ تاکہ ہمارا دل لگا رہے۔" کامران مسکرا کر بولا تو سارے کزنز کھی کھی کرنے لگے۔ چندن کو اس کا معنی خیز جملہ سمجھ میں نہ آیا لہٰذا وہ چپ ہی رہی۔

"چلیں خالہ! ایسا کرتے ہیں کہ اس بار چھٹیوں میں آپ کے پاس ضرور آئیں گے میں اور زیب۔ اب خوش؟" کامران نے کہا۔

"دیکھوں گی نا۔"

"بالکل بالکل۔ میں اور زیب اکٹھے آئیں گے۔ کیوں زیب؟" کامران نے اس کے گھورنے پر کان دبا کے منہ پھیر لیا۔

"اوہو ..... تو خالہ آئی ہیں۔ زہے نصیب، زہے نصیب۔ وہ آپ کو دیکھ کر ایک بھلا سا شعر یاد آ رہا ہے وہ کیا کہتے ہیں حضرت شاعر کہ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے، کبھی ہم ان کو اور کبھی اپنے روم کو دیکھتے ہیں۔"

علی کی بھاری شوخ آواز نے چندن کو متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ دروازے کے اندر داخل ہوتا ہوا، سفید کلف دار شلوار قمیض میں ملبوس علی اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ کھڑا تھا۔

"السلام علیکم خالہ جان!" وہ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"وعلیکم السلام..... جیتے رہو۔ آ گیا خالہ کا خیال؟ کب سے بیٹھی ہوں انتظار میں کہ اب آئے گا، اب آئے گا۔ اور تم ہو کہ سارے دن کے بعد اب شکل دکھا رہے ہو۔" خالہ نے اسے پیار کرتے ہوئے شکوہ کیا اور ساتھ ہی پاندان سے بنے ہوئے پان کی گلوری نکال کے منہ میں دبالی۔

"ارے خالہ! اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ آپ میری راہوں میں نظریں بچھائے بیٹھی ہیں تو میں اس ناہنجار اشعر کے گھر کبھی نہیں جاتا۔" وہ افسوس ناک لہجے میں بولا۔

"ویسے میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ پلین سے آئیں گی اور آپ کے استقبال میں ہم پورے ایئر پورٹ کو پھولوں سے سجائیں گے۔ رن وے سے لے کر باہر پارکنگ تک پھول ہی پھول بچھا دیں گے۔ ریڈ کارپٹ ریسپشن دیں گے۔ پورے باجے گاجے کا انتظام کریں گے۔ لیکن آپ نے تو ٹرین سے آ کر سارے منصوبوں پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔"

"گھڑوں کا زمانہ چلا گیا ہے بڑے بھائی۔ آج کل ڈیپ فریزر کا دور ہے۔" کامران نے ٹکڑا لگایا۔

"ابے چپ۔ ڈیپ فریزر کے پانی سے کیا خالہ کو فریز کرنا ہے؟" علی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"خالہ کو نہیں، آپ کو۔ گھڑوں پانی آپ پر پڑنا تھا۔" کامران نے فوراً تصحیح کی۔

"ویسے خالہ! آپ پلین میں کیوں نہ آئیں؟" علی کو وجہ معلوم تھی پھر بھی چھیڑ خانی کرنے کی غرض سے پوچھ رہا تھا۔

"اے بھیا! جہاز میں آئیں میرے دشمن۔ اور بالفرض خدانخواستہ اگر آ بھی جاتی تو جیسے تم کو تو ایسا ہی استقبال کرنا تھا۔" خالہ پان چباتے ہوئے بولیں۔

"ویسے خالہ! آپ ہیں بہت سویٹ۔ دشمنوں کو بد دعا بھی دی تو پلین میں بیٹھنے کی۔ بھئی کسی گدھے، خچر پر بیٹھنے کی بد دعا دیتیں تو بات بھی تھی۔" علی ہنسا۔

"تیری شوخیوں کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔" خالہ مسکرائیں۔

"مانتی ہیں ناں پھر۔" علی نے اکڑ کر کہا۔

"ذرا نہیں بدلیں تیری شوخیاں۔"

"ماشاء اللہ کہیں۔ نظر مت لگائیں۔" وہ جھٹ بولا۔

"ماؤں کی نظر نہیں لگا کرتی بچوں کو بیٹا جی۔ وہ زبان سے کہیں یا نہ کہیں۔ لیکن ان کا دل، ان کی نظر ہر وقت اپنے بچوں کے لئے دعا ہی مانگا کرتی ہے۔" وہ محبت سے سرشار لہجے میں بولیں اور علی مسکرانے لگا۔ اچھی طرح جانتا تھا خالہ اس گھر کے ایک ایک فرد پر اپنا آپ بھی لٹانے سے دریغ نہیں کرتیں۔ بہت چاہتی ہیں وہ عقیل ہاؤس کے مکینوں کو۔ ایسی محبت تھی ان کے دل میں اس خاندان کے لئے۔ وہ تو بس ان سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا اور خالہ بھی اس کی کسی بات کا برا نہیں مناتی تھیں۔ کیونکہ وہ اس کی عادتوں سے بخوبی واقف تھیں۔

"چندن سے ملیں بھائی!" عرشیہ نے اس کی توجہ چندن کی طرف دلائی جو تائی امی کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی تھی اور علی کی نگاہ اس پر ابھی تک نہ پڑی تھی۔ نہ ہی اس نے چندن کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

"کون چندن.....؟" وہ چونکا اور بہن کی شکل دیکھنے لگا۔

"ارے بھئی یہ چندن۔" عرشیہ نے ماں کے پاس بیٹھی چندن کی طرف اشارہ کیا تو علی نے اس طرف دیکھا۔ ایسا بے داغ حسن دیکھ کر تو علی جیسا بندہ بھی ایک ثانیے کو پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ اس کا حسن واقعی اس قدر جاذب نظر تھا کہ دیکھنے والا لمحہ بھر کو پلکیں جھپکنا بھول جاتا تھا۔ لیکن علی نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

"السلام علیکم۔" اس نے بڑی شرافت سے سلام کیا۔ جس کا جواب دھیمے سے چندن نے دیا۔ علی نے تو پھر اپنی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا تھا لیکن نجانے کیوں زیب علی کا چندن کو دیکھنا بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بہانے سے علی کو وہاں سے ہٹا دے۔

"بھئی کسی نے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا تعارف کرانے کی کوشش ہی نہیں کی تو اس میں بھلا مجھ غریب کا کیا قصور ہے؟" وہ بولا۔

"آپ فکر مت کریں جناب! اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ ہم کئے دیتے ہیں۔" کامران نے پیچھے سے ہانک لگاتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

"تو پھر نیک کام میں دیر کیسی.....؟" لیکن اس سے پہلے کہ کامران اپنا منہ کھولتا،

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بوا کریمن اندر داخل ہوئیں اور کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔

"یہ بوا کریمن ہمیشہ غلط وقت پر ہی کیوں نازل ہوتی ہیں؟" کامران منہ بناتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ کھانا تناول کرنے کے بعد تم اپنا یہ فرض پورا کر دینا۔" علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

سب لوگ اٹھ کر کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہیں پر لمبا سا دستر خوان بچھا ہوا تھا جس پر انواع و اقسام کے کھانے چن دیئے گئے تھے۔ دادی کا حکم تھا کہ کھانا سب لوگ مل کر اکٹھے ایک ہی دستر خوان پر کھایا کریں۔ انہیں میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے سے چڑ تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ اس طرح نہ تو انسان آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا ہے اور نہ ہی کھانا اچھی طرح ہضم ہو سکتا ہے۔ جبکہ زمین پر بیٹھ کر انسان قدرے اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے۔

اس وقت بھی لوگ دستر خوان پر موجود تھے۔ جلیل احمد، خلیل احمد اور طفیل احمد بھی موجود تھے۔ جبکہ عقیل احمد کے دوست کے بیٹے کی آج بارات تھی لہٰذا وہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ چندن کا تعارف سلمٰی چچی نے کرا دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کی موجودگی پر کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا۔

"بیٹے! میں آپ کی والدہ کا کیس کل ہی اسٹڈی کر لوں گا۔ یو ڈونٹ وری اباؤٹ دس۔" جلیل احمد رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تھینکس۔" چندن بولی۔

کھانے کے دوران یوں تو بزرگوں کی موجودگی میں نوجوان پارٹی نے اپنی زبان پر قابو رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی فقرہ علی یا کامران کی زبان سے پھسل ہی جاتا اور جواب میں کسی نہ کسی بزرگ کی گھورتی ہوئی نظر پڑتے ہی وہ زبان دانتوں تلے داب لیتے۔

"بھابی! ہماری یہ مہمان کچھ تکلف سے کام لے رہی ہیں۔ ذرا دیکھئے تو۔" طفیل احمد نے چندن کو قدرے تکلف سے کھاتے دیکھا تو تائی امی کی توجہ اس طرف دلائی۔

"ہاں بھئی ...... یہ تو واقعی تکلف کر رہی ہیں۔ شرماؤ نہیں بیٹا! ٹھیک سے کھاؤ۔" خلیل احمد نے نرمی سے کہا۔

"جی، میں ٹھیک سے ہی کھا رہی ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔

"بیٹے! تمہارا اپنا گھر ہے...... کھانے میں تکلف مت کرو۔" تائی امی نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

"واوو! امی کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ جو گھر دادا جی نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے بنایا ہے اسے ان محترمہ کو سونپنے کا سوچ رہی ہیں۔" علی نے دادی کے کان میں سرگوشی کی مگر یہ سرگوشی اتنی تیز تھی کہ وہاں موجود ہر شخص نے صاف سن لی۔ طفیل احمد اور خلیل احمد دونوں ہی مسکراتے ہوئے دستر خوان سے اٹھ گئے۔

"ہیں، ہیں ...... میں نے ایسا کب کہا شیطان؟" تائی امی بوکھلا کے بیٹے کی شکل دیکھنے لگیں۔

"ابھی کہہ نہیں رہی تھیں کہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ جملہ تو اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔" وہ شوخی سے بولا۔

"توبہ ہے لڑکے ...... بات کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہو۔ بیٹی! تم اس شیطان کی باتوں میں مت آنا۔ اس کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔ تم برا مت ماننا۔" وہ چندن سے بولیں کہ کہیں وہ برا ہی نہ مان جائے۔

"ارے نہیں آنٹی۔ میں سمجھتی ہوں۔ اٹس او کے۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"دیکھا کتنی سمجھدار ہیں۔ ہماری صحبت میں رہیں گی تو اور سمجھ دار ہو جائیں گی۔ کیوں خالہ، ٹھیک کہا نا؟" علی نے خالہ کی طرف دیکھا۔ لیکن زیب نے بہت ہی غور سے علی کو دیکھا تھا۔ اس وقت نجانے کیوں وہ علی کی اس بات کو کوئی معنی پہنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ علی نے یہ فقرہ صرف شوخی میں کہا تھا۔ شاید زیب یہ سب لاشعوری طور پر کر رہی تھی۔

"ہو چکیں سمجھ دار تمہاری صحبت میں۔ ارے بیٹا جی! جس نے تمہاری صحبت اختیار کی، اس سے تو شیطان بھی پناہ مانگے۔" تائی امی بولیں۔

"تو مانتی ہیں نا اپنے بیٹے کو؟ مسٹر شیطان ہر ایک سے پناہ نہیں مانگا کرتے۔" وہ اکڑ کے بولا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چندن نے بڑے غور سے اس نٹ کھٹ سے لڑکے کی طرف دیکھا جس کی گھور سیاہ آنکھوں میں شوخیاں ہی شوخیاں ہر وقت رقصاں رہتیں اور بس۔ جس کے وجیہہ چہرے پر عجب متانت و وقار جھلکتا تھا۔ جس کی ستواں ناک تلے مسکراتے بھرے بھرے لب جیسے زندگی کا پیغام سناتے ہوں۔ جس کے چہرے پر وہ کچھ تھا جو بہت کم مردوں کے چہروں پر نظر آتا ہے۔ ایک عجیب سی کشش تھی اس میں کہ وہ اس کی جانب کھنچی چلی گئی اور اپنی اس کیفیت پر وہ اندر ہی اندر خود ہی گھبرا گئی۔

''کیوں بچے! کھانا کیوں چھوڑ دیا؟'' دادی نے اسے ہاتھ کھینچتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''بس..... میں کھا چکی ہوں۔''

''ارے..... اتنا سا..... بھئی ہمارا تو آدھا پیٹ بھی نہیں بھرا اور آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔'' کامران بولا۔

''تو تم اپنی اور ان کی جسامت کو بھی دیکھ لو بھائی میرے۔'' علی نے کھیرے کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کامران کے اچھے خاصے صحت مند جسم کی طرف اشارہ کیا۔

''نظر مت لگاؤ مجھے اچھا۔ بہت ہلکا خون ہے میرا۔ فوراً نظر لگ جاتی ہے۔'' وہ منہ بنا کے بولا۔

''نہیں لگے گی آج نظر۔'' علی بولا۔

''کیوں.....؟'' زوبیہ نے بے اختیار پوچھ لیا۔

''اس لئے کہ آج ان کے ساتھ ''نظر بٹو'' بیٹھے ہیں۔'' علی کا اشارہ صاف صاف زیب کی طرف تھا جو اسوقت کامران کے ساتھ بیٹھی چندن کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر غور کر رہی تھی۔ علی کا فقرہ مکمل ہوتے ہی وہ چونکی۔

''کیا.....؟'' اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کامران کو دیکھا۔

''تمہیں نظر بٹو کہہ رہے ہیں۔'' کامران نے فوراً کہا۔

''اچھا..... اور خود کیا ہیں؟'' زیب نے تلملا کے طنزیہ لہجے میں علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی ہم تو بندۂ ناچیز ہیں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''گلفام کہئے بھائی۔'' عثمان نے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... کہہ تو تم درست رہے ہو۔ کسی گلفام سے کم تو ہوں بھی نہیں۔ کیوں دادو؟'' اس نے سامنے بیٹھی دادی سے داد لینا چاہی۔

''جی ہاں..... تبھی تو لوگ دھڑا دھڑ گرتے ہیں جہاں جہاں سے یہ گزرتے ہیں۔'' زیب طنزیہ انداز میں بولی۔

''تبھی تو میں کہوں کہ تایا جان کا ہسپتال اتنا بھرا ہوا کیوں ہوتا ہے؟'' کامران سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''جی خدا کسی کو ایسا بھیانک بھی نہ بنائے۔'' زیب نے گویا اُدھار چکا دیا۔

''اب لوگ میرے حُسن و جمال سے اتنا جیلس ہوتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' علی نے بہت ہی اطمینان سے کہا۔

''ہنہ..... ایسے ہی تو گلفام ہیں نا۔ جلوں گی میں۔'' وہ تلملا کر اٹھی اور اس سے پہلے کہ علی جوابی حملہ کرتا، دادی کی ڈانٹ نے سب کو چپ کرا دیا۔

''خوب رونق لگی رہتی ہے آپ کے گھر..... بوریت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔'' کھانے کے بعد جب سب لڑکیاں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں تو چندن نے کہا۔

''ہاں..... ماشاء اللہ سے کافی رونق لگی رہتی ہے۔ ہم سب کزنز آپس میں بہت پیار کرتے ہیں ایک دوسرے سے..... انجوائے کرتے ہیں لائف کو۔'' عرشیہ نے جواب دیا۔

''خاص طور سے علی بھائی اور کامی خوب رونق لگائے رکھتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی گھر سے دور ہو جائے تو گھر سُونا سُونا لگنے لگتا ہے۔'' زوبیہ نے کہا۔

''لیکن زیب اور علی بھائی کی نہیں بنتی بالکل بھی..... جب تک لڑ نہ لیں ایک دوسرے سے، کھانا ہضم نہیں ہوتا ہے ان کا۔'' عاصمہ اپنے دوپٹے پر سفید لیس لگاتی ہوئی بولی۔

''یہ تو دونوں کی عادت بن چکی ہے۔'' عرشیہ مسکرائی۔ ''کہتے ہیں اس قسم کی لڑائی میں محبت پنہاں ہوتی ہے۔'' عرشیہ نے شوخ نظروں سے بظاہر ٹی وی دیکھتی زیب کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔

"کیا...... کیا......؟" وہ پوری کی پوری عرشیہ کی طرف گھوم گئی۔ جبکہ چندن کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے بہت غور سے زیب کو دیکھا جس کے چہرے پر کوئی خاص رنگ نہ تھا۔ "کہیں عرشیہ نے جو کہا وہ سچ تو نہیں ہے؟" خدشے نے اس کے دل میں سر ابھارا لیکن زیب کے چہرے پر اس کی کوئی تحریر نظر نہ آئی۔ وہ عرشیہ سے الجھ رہی تھی اس بات پر کہ اس نے یہ بات کہی کیوں۔ اور عرشیہ ہنستے ہوئے اس سے معذرت کر رہی تھی۔

"اچھا بابا! معاف کر دو ...... میری توبہ جو آئندہ یہ بات کہوں۔" عرشیہ نے باقاعدہ کان پکڑ لئے۔ تب زیب نے اس کی جان چھوڑی۔

"چندن! آپ پہلے بھی کراچی آئی ہیں؟" زوبیہ نے اچانک ہی اس سے سوال کیا۔

"ہاں، بہت دفعہ......" چندن نے سر ہلا دیا۔

"اچھا ...... کس سلسلے میں؟" اس نے پھر پوچھا اور اس کے سوال پر وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔

"ایسے ہی۔ می کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے۔" اس نے بات بنائی۔

"تمہارے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟" اس بار عرشیہ نے پوچھا۔

"ممی کی اکلوتی اولاد میں ہی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اچھا ...... تو کیا گھر میں آپ اور آپ کے ممی ڈیڈی بس تین ہی لوگ ہیں؟" عاصمہ نے پوچھا۔

"ڈیڈی......" چھن سے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ "میرے فادر نہیں ہیں۔" اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"اوہ ...... آئی ایم سوری۔ مجھے پتہ نہ تھا۔" عاصمہ شرمندگی سے بولی۔

"اٹس اوکے......" اس نے خود کو سنبھالا۔

"پھر تو تمہیں تنہائی کا احساس بھی بہت ہوتا ہوگا۔" عرشیہ افسردگی سے پوچھ رہی تھی۔

'تنہائی کا احساس ...... ہاں ہوتا ہے۔ بہت شدت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ میرا ہمدرد ہے کوئی اور نہ ہی دوست۔ میں ہجوم میں رہتی ہوں لیکن پھر بھی تنہا ہوں۔ مجھے تو تمہاری دنیا کے لوگوں نے تنہا کر دیا ہے۔' وہ گہری سانس لیتے ہوئے سوچنے لگی۔

"اُفوہ ...... آپ کیا باتیں لے بیٹھے۔" ماحول کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر زیب نے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت خالدہ آ گئیں۔

"ارے بچیو! رات کے ڈیڑھ بج رہے ہیں۔ اب سو جاؤ چل کے۔ بچی (چندن) کو بھی نیند آ رہی ہو گی۔ مارے مروت کے کچھ کہہ نہیں رہی ہے۔ لیکن تم لوگ ہی کچھ خیال کرو۔ باقی باتیں صبح کر لینا۔" انہوں نے مداخلت کی اور محفل برخاست ہو گئی

چندن نے خالدہ کی آمد کو غنیمت جانا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ان لوگوں نے اس سے کچھ ایسا پوچھ لیا جس کا جواب اس کے پاس نہ ہوا تب کیا ہوگا؟ اسی سوچ نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ لیکن عین وقت پر خالدہ کی مداخلت سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔

اس رات وہ ٹھیک سے سو نہ سکی۔ بہت سے ادھورے ارمان، نامکمل خواہشیں، بہت سے ملال، بہت سی حسرتیں اسے سونے نہیں دے رہی تھیں...... 'میں یہاں کیوں چلی آئی؟...... نہیں آنا چاہئے تھا مجھ کو یہاں......' وہ بوجھل دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

اگلے دن ناشتے کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلیل احمد سے ملنے کے بعد یہاں سے فوراً روانہ ہو جائے گی۔ مزید نہیں رکے گی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ مزید یہاں رکی تو نجانے کیا ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تائی امی سے کہہ کر جلیل احمد سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتی وہ خود ہی اسے لے کر ان کے پاس چلی آئیں۔

"وہ اسٹڈی میں تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں بیٹی۔ تم سے مل کر ہی ہسپتال جائیں گے۔" تائی امی نے راستے میں اسے بتایا۔

جب ان کے ساتھ وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی تو جلیل احمد ایزی چیئر پر جھولتے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں پائپ تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ کتاب کے صفحات الٹ رہے تھے۔ آہٹ کی آواز پر انہوں نے سر اٹھایا۔

"آؤ بیٹے ..... بیٹھو۔" انہوں نے چندن کو دیکھتے ہوئے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر دیا۔ "چائے یا کافی؟" وہ اس سے پوچھنے لگے۔

"تھینکس۔ میں نے ابھی ناشتہ کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ..... ایک کپ ہمارے ساتھ بھی پی لو۔" وہ مسکرائے تو اس نے سر ہلا دیا۔ "بیگم! دو کپ کافی بوا کے ہاتھ بھیج دیں۔" انہوں نے رقیہ سے کہا۔

تائی امی باہر چلی گئیں تو انہوں نے چندن سے اس کی ماں کی کیس فائل مانگی۔ چندن نے فائل ان کی طرف بڑھا دی۔ جلیل احمد فائل کے مطالعہ میں محو ہو گئے اور چندن یونہی بے توجہی سے اسٹڈی کا جائزہ لینے لگی۔ بہت سادہ اور پُر وقار انداز میں سیٹ کی گئی تھی۔ شیلف میں موٹی موٹی کتابیں بھری پڑی تھیں۔ ان کی ضخامت دیکھ کر ہی چندن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہوں گی۔

اس کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی جلیل احمد کے چہرے پر جا ٹکیں۔ وہ یونہی بے خیالی میں ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سرخ و سپید رنگت والے بھرے بھرے چہرے پر سیاہ مونچھیں جن میں اب سفیدی جھلک رہی تھی ان کے چہرے کے وقار کو بڑھا رہی تھیں۔ سر کے بالوں میں بھی چاندی جھلک رہی تھی۔ ان کی شکل علی سے بہت ملتی تھی۔ فرق تھا تو بس رنگت کا۔ ان کی رنگت گوری تھی جبکہ علی کی رنگت سرخی مائل گندمی۔ جیسے گندم کے کھیت پر ڈھلتے سورج کا عکس پڑتا ہے اور اس میں سے سنہرا پن چھن چھن کر نظر آتا ہے۔ بڑھاپے میں علی بالکل ایسے ہوں گے۔ وہ بالکل لاشعوری طور پر ان کے چہرے میں علی کا عکس ڈھونڈ رہی تھی کہ بوا کی آمد نے اسے چونکا دیا۔ بوا کافی کی پیالیاں سامنے رکھ کر چلی گئیں۔

جلیل احمد نے کافی دیر بعد اپنا سر اٹھایا۔ فائل بند کر کے میز پر رکھی اور پائپ کا کش لگاتے ہوئے چندن کی طرف دیکھنے لگے۔

"بیٹے! تمہاری والدہ کا کیس اچھی طرح اسٹڈی کیا ہے میں نے۔" وہ کہہ کر

رکے۔ کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد انہوں نے کپ نیچے رکھا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"خطرے والی بات تو نہیں ہے؟" وہ بے صبری سے پوچھنے لگی۔

"خطرے والی بات تو ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے اور چندن نے ہونٹ بھینچ لئے۔

"یہ تو بتاؤ کہ تمہارے والد صاحب کہاں ہیں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"والد صاحب..... وہ حیات نہیں ہیں۔" اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"اوہ ..... ویری سیڈ۔" انہیں افسوس ہوا۔ "کوئی بڑا بھائی یا بہن؟" انہوں نے پھر سوال کیا۔

"کوئی نہیں ..... میں اور ممی اکیلے رہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کوئی رشتہ دار، عزیز؟" اس بار وہ حیرت زدہ سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ کو حیرت ہو گی سن کر ..... ہم ماں بیٹی اس دنیا میں بالکل اکیلے ہیں۔ کسی بھی مضبوط سرپرست کے ساتھ کے بغیر۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"اوہ ..... مگر....."

"میں آپ کے کہنے کا مطلب سمجھ سکتی ہوں سر! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کچھ لوگ دنیا میں تنہا ہوتے ہیں اور کچھ لوگ تنہا کر دیئے جاتے ہیں۔ ان دونوں اقسام کے لوگوں کو بھی اپنی زندگی کے دن اکیلے کاٹنے ہوتے ہیں۔ اپنے سارے پرابلمز کو خود ہی فیس کرنا ہوتا ہے۔ زندگی سے اپنے لئے دن چھیننا پڑتے ہیں۔ بس ہمارا بھی شمار کچھ ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ ورنہ تنہا رہنے کا شوق کس کو ہوتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کا بھی بھرا پرا گھرانہ ہو۔ محبت کرنے والے لوگ ہوں۔ اس کا غم، اس کی خوشیاں شیئر کرنے والا کوئی ہو۔ کوئی ہو جس سے وہ اپنے ہر قسم کے احساسات بانٹ سکے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ کتنی حسرتیں تھیں اس کے لہجے میں۔ کتنا کرب گھلا ہوا تھا۔ علی کے قدم جیسے وہیں رک گئے۔ جلیل احمد بھی کچھ چپ سے ہو گئے تھے۔

"ایکسکیوزمی ابو!" اس نے چندن کے خاموش ہوتے ہی اندر آتے ہوئے کہا تو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چندن چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وائٹ کلر کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں وہ بڑا نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔

"سوری فار ڈسٹربنس۔ لیکن مجھے یہ لیٹر دینا تھا۔ انکل حمید نے دیا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ صرف آپ ہی کو دوں۔" اس نے ایک خاکی رنگ کا لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

"اوہ ..... اچھا، ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گا۔" انہوں نے لفافہ اس سے لیتے ہوئے کہا۔ وہ واپس چلا گیا۔

"آپ مجھے ممی کے متعلق بتا دیں۔ جو مسئلہ ہے، مجھ سے ڈسکس کریں۔" علی کے جانے کے بعد وہ بولی۔

"دراصل تمہاری والدہ کی بیماری خطرناک صورتحال اختیار کر گئی ہے۔ تم ابھی کم عمر ہو اس لئے میں نے سوچا تھا کہ اگر تمہارا کوئی بزرگ ہوتا تو میں اس سے بات چیت کر لیتا۔"

"آپ کہہ دیجئے ..... مجھے ہی بزرگ سمجھئے۔" اس بار وہ ذرا سا مسکرائی۔ لیکن کس مشکل سے، یہ وہی جانتی تھی۔ "میری عمر کو مت دیکھیں۔ عمر کم سہی لیکن حوصلہ بڑا ہے۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"ایکسیلنٹ۔ تمہارا اعتماد اور حوصلہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ تمہاری کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" انہوں نے اس کے سامنے رکھے کپ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے کپ اٹھا کے خاموشی سے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تمہاری ممی کا مرض کافی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ انہیں فوراً ہی ہاسپٹل ایڈمٹ کرانا ہوگا..... پشاور میں وہ سرجن عبدالرحمٰن کے ہی زیر علاج رہی ہیں نا؟" انہوں نے استفسار کے سے انداز میں پوچھا۔

"جی....." اس نے سر ہلا دیا۔ "آپ سے علاج کروانے کا مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا۔"

"ہوں ..... میں رپورٹس پر نام پڑھ چکا ہوں ان کا۔" لمحہ بھر کو وہ رکے اور کافی کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ "عبدالرحمٰن میرے بہت

ہی اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ ہم دونوں نے اکٹھے ہی ہاؤس جاب کرنے کے بعد کافی عرصہ تک کام بھی اکٹھے ہی کیا تھا۔ پھر ان کا ٹرانسفر پشاور ہو گیا۔ لیکن اب بھی رابطہ ہے ہمارا۔ کبھی فون پر بات چیت ہوتی ہے یا کسی کانفرنس یا میٹنگ وغیرہ میں ملاقات ہو جاتی ہے۔" وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بتا رہے تھے۔ "میں ان سے بات کروں گا۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔"

"کس سلسلے میں.....؟" چندن نے چونک کر پوچھا۔

"تمہاری والدہ کو فوراً کراچی لانا ہوگا۔ ہم یہاں ان کو اپنے ہسپتال میں شفٹ کریں گے۔" وہ کہنے لگے۔

"کب تک لانا ہوگا؟"

"جس قدر جلدی ہو سکے۔ عبدالرحمٰن سے میں آج ہی بات کر لوں گا۔ تم پشاور جا کر ان سے ضرور مل لینا فوراً ہی۔" انہوں نے ہدایت کی۔ "اور اگر کسی مدد کی ضرورت ہو یا کوئی بھی پرابلم ہو، کسی قسم کا بھی تو ہم حاضر ہیں۔ ہمیں غیر مت سمجھنا۔ تم بھی میرے لئے عرشیہ اور زوہیب کی طرح ہو۔" وہ بڑی شفقت اور خلوص سے کہہ رہے تھے۔

"تھینکس ..... تھینکس اے لاٹ۔ آپ نے صرف پوچھ لیا، اتنا ہی بہت ہے۔ ورنہ آج کل کے دور میں کسی کو کسی سے ہمدردی کرنے کی فرصت بھی کہاں ہے۔ مجھے کوئی پرابلم ہوئی تو آپ سے ضرور شیئر کروں گی۔" وہ تشکر آمیز اور بھیگے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ نجانے آنکھیں کیوں بھر آئی تھیں۔

"نو، نو بیٹا ..... ایک باہمت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو ..... کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے بولے۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سخت سے سخت بات بھی آرام سے سہہ جاتا ہے۔ لیکن کسی سے دو بول ہمدردی کے، محبت کے، اپنائیت کے سن لے تو اس کا دل بھر آتا ہے۔" وہ یاسیت سے بولی۔ خلیل احمد کو پیاری سی وہ لڑکی بہت دکھی لگی جس کا دل زخموں سے چور چور تھا۔

"تم جیسی اچھی لڑکی کے ماں باپ کس قدر خوش قسمت ہیں۔ دنیا کی ہر لڑکی اگر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تمہاری طرح بن جائے تو کتنا ہی اچھا ہو۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولے اور چندن سر سے پیر تک لرز اٹھی۔

..... یا اللہ! یہ کیسی بد دعا دے دی اے بھلے شخص ..... انجانے ہی میں سہی۔ اوہ ..... میرے خدا ..... کاش کہ زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی .....

مارے اذیت کے اس نے اپنے لب کاٹ لئے۔ وہ تڑپ کے کھڑی ہو گئی اور جلیل احمد چونک کر اس کو دیکھنے لگے۔

"مجھے آج ہی جانا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے ..... زیادہ دیر اچھی بھی نہیں۔ ان کے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" ان کا اشارہ چندن کی ماں کی طرف تھا۔ "علی سے کہہ کر میں ٹکٹ کا بندوبست کراتا ہوں۔" وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

❁

علی اس کے لئے ٹکٹ لے آیا تھا۔

"بہت مشکل سے فلائٹ ملی ہے پانچ بجے کی۔" وہ بتا رہا تھا۔

خالہ کا ابھی مزید رکنے کا پروگرام تھا اور نہ بھی ہوتا تب بھی انہیں پلین میں تو ہرگز نہیں جانا تھا۔

"جاؤ بیٹی! خدا تمہاری ماں کو صحت دے۔" دادی نے اسے پیار کرتے ہوئے دعا دی۔ "اور تمہارے بخت بھی اچھے کرے۔"

'اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"تم اپنی والدہ کو لے کر یہیں آ جانا۔" تائی امی بڑے خلوص سے دعوت دے رہی تھیں۔

"بہت شکریہ آنٹی۔ ہمارا ایک ذاتی فلیٹ ہے کلفٹن پر۔ ہم وہیں ٹھہریں گے۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ سب کی محبتیں میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" وہ اپنے مرمریں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیتے ہوئے بولی۔

"لیکن ملنے تو آ سکتی ہو نا.....؟" عرشی بولی۔

"ضرور ..... ضرور آؤں گی۔" اس نے وعدہ کر لیا۔ پھر باری باری وہ سب سے

ملی۔ اس نے ٹکٹ کے پیسے دینے چاہے تو تائی امی بہت ناراض ہوئیں۔

"تم ہماری بچیوں کی طرح ہو چندن! بھلا اپنے بچوں سے کوئی پیسے لیتا ہے؟" انہوں نے اسے لاجواب کر دیا۔

علی کی آج نائٹ تھی لہٰذا جلیل احمد نے چندن کو ایئر پورٹ چھوڑنے کی ذمہ داری اسی پر ڈال دی تھی کہ وہ پھر وہیں سے سیدھا ہسپتال چلا جائے گا۔ گاڑی میں وہ ان گنت مرتبہ بیٹھی تھی لیکن سرور اس کو آج یہاں علی کی سنگت میں مل رہا تھا۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل دھڑکا تھا۔ ایک عجیب سے انداز میں۔ ایک عجیب سا احساس اندر جاگا تھا۔ میٹھا میٹھا سا درد تھا۔ کیسا مدہوش کن احساس تھا۔ کیسا حسین تاثر تھا۔ دل کی دھڑکنیں عجیب سے سُر میں دھک دھک کر رہی تھیں۔ سانسیں جیسے معطر معطر ہو رہی تھیں۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو اس کی سانسوں میں رچ گئی تھی اور یہی خوشبو اسے بدمست کئے دے رہی تھی۔ اس سے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ شخص، جس کو ملے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی اس کے پور پور میں رچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کار میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ اے سی کی ٹھنڈک میں اس کے بدن کی مہک بھی رچی ہوئی تھی۔ چندن نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا۔ یہ شخص جو آج اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا، کل سے پہلے وہ اسے جانتی تھی نہ پہچانتی تھی، پھر کیا ہوا جو یہ انجان شخص اس کے رگ جاں سے بھی قریب ہو گیا۔ شاید محبت کے لئے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ ایک لمحہ۔ بس ایک لمحہ ..... یہی ایک لمحہ ..... یہی ایک پل ہوتا ہے جو برسوں پر بھاری ہوتا ہے۔ یہی ایک پل ہوتا ہے جس میں انسان اپنا آپ ہار بیٹھتا ہے۔

اور یہی ہوا تھا اس کے ساتھ بھی۔ اسی ایک پل میں وہ اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ ایک پل کو وہ یہ بھی بھول بیٹھی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ اس کا مقام کیا ہے.....؟ اسے یاد رہا تو بس صرف اتنا کہ وہ شخص اس کے پاس، اس کے پہلو میں بیٹھا ہے جو ساری دنیا سے الگ ہے۔ منفرد ہے۔

اس گھر کے لوگوں سے الگ ہوتے ہوئے اسے واقعی دکھ ہوا تھا۔ کتنا عجیب سا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تاثر چھوڑا تھا اس گھر کے افراد نے اس کے ذہن پر۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتی تھی کہ اس دنیا میں ہر فرد کسی نہ کسی مطلب کی خاطر دوسرے سے ہمدردی کرتا ہے۔ کسی کا شہد میں ڈوبا لہجہ اپنے اندر مطلب کا زہر لئے ہوتا ہے۔ کسی کی بظاہر پُر خلوص مسکان کے پیچھے بھی نجانے کتنے پُر فریب مطلب چھپے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے ملتا ہے تو بھی اس کے پیچھے مطلب پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس کی عمر بہت کم تھی لیکن دنیا کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتی تھی۔ لوگوں کے چہروں اور آنکھوں سے ان کے دل پر لکھی تحریر کو پڑھ لینے کا فن آتا تھا اس کو۔ شاید یہ صلاحیت اس میں حالات نے پیدا کر دی تھی یا خداداد ہی تھی جس کو حالات کی آتش نے نکھار دیا تھا۔ اس نے عتیل ہاؤس کے مکینوں کے چہروں پر جو تحریر پڑھی تھی وہ تحریر اس دنیا میں آج کے زمانے میں بہت کم نظر آتی تھی۔ علی، جس نے اس کے دل کو ایک نئے انداز میں دھڑکنا سکھایا تھا، وہ اس کے لئے کیا بن چکا تھا۔ کوئی دیوتا ..... جس کو وہ اپنے من مندر کے سنگھاسن پر بٹھائے اس کی پوجا کرتی رہتی ..... یا کوئی فرشتہ ..... شاید وہ محبت کی انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ اسی لئے ایک انسان کو دیوتا اور فرشتے کا درجہ دے بیٹھی تھی۔ وہ جو مردوں کو شیطان سمجھتی تھی، آج ایک مرد ہی نے اس کے دل کو زیر کر لیا تھا۔

وہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ کب ایئر پورٹ آیا، پتہ ہی نہ چلا۔ چونکی تب، جب علی نے اسے پکارا۔

''کہاں کھو گئیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آں ..... کچھ نہیں۔'' اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

''ٹکٹ چیک کر لیجئے۔'' وہ سن گلاسز اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں ..... میں نے گھر سے نکلتے ہوئے کر لئے تھے چیک۔'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور ایک نظر اس کی سیاہ گھور آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُف ..... کیسی گہرائیاں تھیں ..... کہ وہ ڈوبتی چلی جا رہی تھی ..... کیسی چمک تھی جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا ..... اس نے گھبرا کے پلکیں جھکا لیں اور کار سے نیچے اتر آئی۔ علی اس کا بیگ اٹھائے اس کے پاس چلا آیا۔

''او کے مس چندن! وِش یو بیسٹ آف لک۔'' وہ بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھینک یو۔'' چندن نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔

''او کے، اللہ حافظ۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہو گی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''انشاء اللہ ..... ضرور۔'' چندن کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

وہ تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک چندن اندر داخل نہ ہو گئی۔ چندن نے بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے صرف ایک نگاہِ بے تاب سیاہ شیشوں کے پار ڈالی تھی۔ چندن نے ایک طویل سانس لی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔

✲

اس نے کراچی ایئر پورٹ ہی سے فون کر کے کار منگوا لی تھی۔ لہٰذا جیسے ہی وہ باہر نکلی، ڈرائیور منتظر نظر آ گیا۔ اسے سلام کرتے ہوئے اس نے بیگ چندن کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی کار تک پہنچی۔ ڈرائیور نے جھٹ دروازہ اس کے لئے وا کر دیا۔ وہ اندر بیٹھی تو ڈرائیور سرعت کے ساتھ دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پورا راستہ خاموشی کے ساتھ کٹا۔ کار مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بہت بڑی کوٹھی کے آہنی دیوہیکل گیٹ کے سامنے رکی۔ دوسرے ہارن پر ہی گیٹ کھل گیا اور ایک باوردی پٹھان چوکیدار نے تیزی سے سلوٹ جھاڑا۔ کار سرخ بجری کی روش پر سے گزرتی ہوئی پورچ میں جا رکی۔ کار رکتے ہی ڈرائیور تیزی سے باہر نکلا اور اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ اسی اثنا میں ایک کم سن، خوبصورت لڑکی باہر نکلتی نظر آئی۔

''سلام بی بی جی۔'' اس نے چندن کو دیکھتے ہی سلام جھاڑا۔

''گلاب! ممی کہاں ہیں؟'' پہلا سوال اس نے ماں کے متعلق ہی کیا۔

''اچھی ہیں ..... آرام کر رہی ہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اچھا۔ تم میرا سامان کمرے میں رکھو۔ میں ذرا ممی کو دیکھ لوں۔'' وہ اسے ہدایت دیتی ہوئی اندر بڑھ گئی۔ اس کا رخ صاحبہ کے کمرے کی جانب تھا۔ اس نے بڑی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی آئی۔ کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا اور اس کی ہلکی سبز روشنی میں کمرا بہت پراسرار لگ رہا تھا۔

وہ دبیز قالین پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی صاحبہ کے بیڈ تک آئی۔ کمزور و لاغر سا جسم۔ جسم تھا یا ہڈیوں کا پنجر ..... وہ تڑپ کے ماں کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ چہرہ بڑھاپے کی تصویر بنا ہوا تھا۔ زرد، اُداس چہرہ۔ ہر خوشی سے دور اور ہر غم سے بہت قریب تھا وہ چہرہ۔ اس کے چہرے پر دکھوں کی ایک طویل داستان رقم تھی۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ کیسا اداس اور کس قدر غمگین لگ رہا تھا۔ وہ اُداسی جو ہوش سنبھالتے ہی دیکھ لی تھی، محسوس کر لی تھی۔ وہ افسردگی اور کرب جو اس کے حسین چہرے کا مستقل "میک اپ" بن چکا تھا، اس کا سنگھار بن چکا تھا۔

اسے یاد تھا کہ اس کی ماں عالم شباب میں کتنی حسین ہوا کرتی تھی۔ ایسی حسین، ایسی خوبصورت کہ جو ایک بار دیکھ لے تو مر مٹے۔ اتنے حسین چہرے بہت ہی کم نظر آتے ہیں دنیا میں۔ ایسا حُسن کہ انسان تعریف کے لئے الفاظ ہی ڈھونڈتا رہ جائے ..... مگر کوئی لفظ اس کے حُسن کے شایانِ شان نہ تھا۔ لیکن اس بیماری اور روگ نے کیسا نچوڑ کر رکھ دیا تھا اس کو۔ وقت سے پہلے ہی اس کے چہرے پر کھنڈروں کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ ہر وقت اپنی ماں کو کسی نہ کسی سوچ میں گم دیکھتی تھی اور پوچھنے پر بھی وہ کچھ نہ بتاتی تھی۔ اسی سوچ نے اسے ٹیومر جیسا مرض عطا کر دیا تھا لیکن وہ حیران تھی کہ ماں اپنے مرض کی خبر سن کر بھی مطمئن تھی۔ بالکل پُرسکون۔

چندن نے جھک کر اپنی ماں کی پیشانی پر ہونٹوں کی مہر ثبت کی اور پھر آہستگی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

بستر نہایت ہی آرام دہ تھا۔ کراچی میں تو ابھی خاصی گرمی تھی لیکن یہاں تو ہیٹر چل رہے تھے۔ اس نے بھی یہاں کی سردی کے پیشِ نظر کمرے میں ہیٹر آن کر رکھا تھا جس کی گرماہٹ اس کے تھکے ہوئے جسم کو قدرے تقویت بخش رہی تھی۔ کمرے میں پھیلی زیرو کے بلب کی نیلی روشنی نے ہر شے کو نیلاہٹ میں بدل دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز نیلی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔

وہ نرم ریشمی کمبل کاندھوں تک اوڑھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی کھلی نیلگوں

ساگر جیسی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے دل و دماغ پر عجیب کسی سحر کی طرح چھایا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو دو سیاہ، چمکدار، شرارت سے بھرپور آنکھیں اس کے سامنے چھم سے آ گئیں۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں تو جیسے جیتا جاگتا لمبا چوڑا وجود اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اس کے سینے میں دھک دھک کرتا دل جیسے پسلیاں توڑ کے باہر آنے کو بے تاب تھا۔ اس نے بے قرار ہو کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ دیا تو اسے لگا جیسے دل کی ہر دھڑکن ایک ہی نام لے رہی ہے۔ علی ..... علی ..... علی .....

وہ بے چین ہو کے اٹھی اور کمرے کی ساری بتیاں روشن کر دیں۔

'یہ کیا ہو رہا ہے مجھ کو ..... بھلا کوئی اس طرح بھی بے کل ہوتا ہے ..... اس طرح بھی کسی کے تصور سے گھبراتا ہے ..... میں ..... میں تو بہت ہی باہمت لڑکی ہوں ..... جس کے سامنے آتے ہی بڑے سے بڑا طرم خان بھی بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا عقل مند اپنی عقل کھو دیتا ہے ..... آج کیسے ایک پرچھائیں سے گھبرا رہی ہوں .....'

وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مسل رہی تھی۔

'نہیں، نہیں ..... مجھ کو ایسا نہیں سوچنا چاہئے ..... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میں کون ہوں ..... جس کا نہ کوئی نام ہے اور نہ نشان ..... نہ پہچان اور نہ ہی حیثیت۔ میں جو زمین پر رُلنے والے ایک معمولی ذرے کے برابر ہوں ..... میں چاند کی تمنا کر رہی ہوں ..... میں کیسے ..... کیسے .....'

وہ اضطراب کے عالم میں ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔

'نہیں علی ..... نہیں ..... میں تمہاری تمنا نہیں کر سکتی ہوں ..... بے شک میں مردوں سے بے حد نفرت کرتی ہوں۔ مرد ..... جو ہرجائی ہوتے ہیں، بے وفائی کرنا جانتے ہیں، عورت سے کھیلنا جانتے ہیں۔ میں ..... میں نے یہ عہد کیا تھا خود سے کہ ہر لالچی مرد کو تباہ کر دوں گی۔ غرق کر دوں گی۔ ان کی تباہی پر جشن مناؤں گی۔ اپنی فتح پر ناچوں گی۔ لیکن میں کیوں ایک مرد کے سحر میں آ گئی۔ میں تو تمہیں دکھ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی ہوں علی ..... اس لئے کہ تم وہ ہستی ہو جس کو میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے بہت پیار سے، بہت مان سے اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں ..... ہاں ..... میں کرتی ہوں محبت۔ اور میں نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ اس لئے کہ یہ جذبہ تو بس اچانک ہی میرے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ میں تو تمہیں پا بھی نہ سکوں گی کہ شمع کی محبت میں پروانے جل جاتے ہیں۔ یہی ان کا مقدر ہوتا ہے۔ چکور، چاند کی آرزو کرتا ہے مگر عمر بھر اس تک رسائی حاصل کرنے کو ترستا ہے۔ میں بھی تم تک نہ پہنچ پاؤں گی۔ اس لئے کہ تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے ..... میں نے تمہاری آنکھوں میں وہ دیکھا ہے اے میرے محبوب! جو آج سے قبل کسی مرد کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ تمہاری ان دو جھیلوں سے گہری، رات سے کالی آنکھوں میں وہ سچائیاں، وہ پاکیزگی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ تمہارے لہجے میں وہ مضبوطی چھپی ہوئی ہے، وہ سادگی ہے جس کی میں متلاشی تھی۔ میں تمہاری وجاہت پر نہیں مٹی ہوں علی ..... میں تو تمہاری روح کے حُسن پر فدا ہوئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا نفس تمہارے قابو میں ہے۔ کتنی خوش قسمت ہو گی وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ زندگی کا سفر کاٹے گی۔'

چندن نے تھکے تھکے انداز میں سر کرسی کی پشت سے ٹکا کے آنکھیں موند لیں۔

'ظالم .....! میں پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ تم کیوں چلے آئے میرے سامنے؟ جب تک تم سامنے نہیں تھے میں جی رہی تھی۔ لیکن اب تو سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اور تم ..... تم شاید بے خبر ہی رہو گے۔ تم کو پہلی ہی نظر میں گھائل کرنے کا فن آتا ہے۔ تبھی تو میری روح، میرا دل سب کچھ زخمی کر ڈالا تم نے۔ تم نے مجھے سزا ہی تو دی ہے۔ انجان ہو تم کہ میرے دل پر تمہارا سایہ پڑ چکا ہے۔ تم میرے لئے مقدس ہو علی ..... میں تمہارے قریب نہیں آؤں گی ..... نہیں آ سکتی تمہارے نزدیک ..... میں اپنی نحوست کا کالا سایہ تم پر کبھی نہیں پڑنے دوں گی ..... میں تم کو اپنی دسترس سے دور رکھوں گی کہ میں صرف تم کو چاہتی ہی نہیں تمہاری عزت بھی کرتی ہوں اور جن کی عزت کی جائے، جن سے محبت کی جائے، ان کے لئے قربانیاں دی جاتی ہیں۔ میں اپنے دل، اپنے جذبات پر قابو رکھوں گی۔ اپنی آنکھوں پر پہرے بٹھا دوں گی۔ تم کو دیکھ کر بھی انجان بن جاؤں گی ..... تمہاری زندگی میں زہر نہیں گھول سکتی میں .....''

جب انسان کا دل بے چین ہو تب اس کو چین نہیں ملتا۔ لمحہ بھر بھی۔ وہ بھی اضطراب کا مسلسل شکار تھی۔ ایزی چیئر پر جھولتے جھولتے نجانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی اور آخر کار کس وقت اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اسے پتہ بھی نہ چلا۔

صبح جب گلاب اس کے کمرے میں آئی اور بیڈ کی بجائے اسے ایزی چیئر پر پایا تو متعجب ہونے کے ساتھ ساتھ فکر مند بھی ہوئی۔

''بی بی! اٹھو۔ یہاں کیوں سو رہی ہو؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''اوہ ..... بس ..... یونہی بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی تھی۔ پھر پتہ ہی نہ چلا۔ ٹائم کیا ہو رہا ہے؟'' چندن نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا اور اٹھ گئی۔ ساری رات ایک ہی پوزیشن میں سر اور گردن رکھنے سے کافی درد ہو رہا تھا۔ جسم بھی تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

''ساڑھے دس بج رہے ہیں جی۔'' گلاب کمبل تہہ کرتی ہوئی بتا رہی تھی۔

''ممی جاگ گئیں؟'' اس نے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔ جاگ گئیں۔ ناشتہ بھی کر لیا اور دوا بھی کھا لی۔'' اس نے اطلاع دی۔

''پتہ ہے کل رات بڑی بیگم کیا کہہ رہی تھیں جب میں انہیں دوا کھلانے گئی تو۔''

''کیا .....؟'' چندن نے بیڈ ٹی پیتے ہوئے اسے دیکھا۔

''کہہ رہی تھیں گلاب! آج مجھے دوا نہ کھلا۔ میں نے پوچھا کیوں بیگم؟ تو بولیں کہ دوا کھانے سے مجھے نیند آ جاتی ہے اور آج میری بچی کو آنا ہے۔ میں کھلی آنکھوں سے اس کا استقبال کرنا چاہتی ہوں۔ نجانے ..... کیا پتہ کہ یہ نیند ابدی نیند ہی نہ بن جائے۔ اور پھر میں اپنی بچی کا من موہنا چہرہ نہ دیکھ سکوں۔'' گلاب بڑی تفصیل سے گزشتہ گفتگو دہرا رہی تھی۔ چندن نے گہری سانس لیتے ہوئے خالی کپ میز پر رکھا۔

''ممی بھی بس .....'' وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

وہ نیچے آئی تو صاحبہ ٹیبل پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

''گڈ مارننگ ممی۔'' وہ اس کے قریب آئی اور اس کی پیشانی چومنے کے بعد ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو چندو؟'' وہ اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کچھ تھکی تھکی سی۔" صاحبہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہاں ممی ..... بہت تھک گئی ہوں میں۔ اب اور نہیں ہوتا سفر۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ مگر بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا یہ بتائیں، ناشتہ کیا آپ نے؟" وہ ٹالنے والے انداز میں بولی اور صاحبہ نے ایک گہری سانس لی۔

"ہاں ..... تمہارے ساتھ بس ایک پیالی چائے پیوں گی۔"

"ابھی منگواتی ہوں۔ گلاب ....." اور گلاب دوسری آواز پر ہی بوتل کے جن کی طرح وہاں موجود تھی۔ "فوراً ناشتہ لے آؤ....." گلاب مڑی۔ "لیکن پہلے چائے لے آؤ۔ میرے اور ممی کے لئے۔" چندن نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"تمہارا سفر کیسا گزرا؟" صاحبہ نے پوچھا۔

"ٹھیک۔" وہ مختصراً بولی۔

"خالہ نہیں آئیں؟"

"نہیں ..... ابھی ان کا ارادہ نہیں تھا۔ آپ سنائیں، کیسا فیل کر رہی ہیں؟"

"میرا کیا پوچھتی ہو چندو۔ آخری وقت میں انسان کا حال کیسا ہو سکتا ہے؟" وہ مسکرائی اور چندن نے تڑپ کر ماں کی طرف دیکھا۔ کیسی یاسیت تھی اس کے لہجے میں۔ کیسی تڑپ تھی۔

"مت کریں ایسی باتیں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ کچھ نہیں ہو گا آپ کو ..... میں اس ملک کے سب سے بڑے برین اسپیشلسٹ سے علاج کرواؤں گی آپ کا۔"

"کیا فائدہ ہے بیٹی! مجھے بہلاؤ مت۔ اپنا انجام تو سامنے ہے میرے۔ چند دنوں کی مہمان ہوں میں۔ کچھ دن تمہاری اس دنیا میں گزاروں گی اور پھر اس بے ثبات حیات سے نجات مل جائے گی۔ اچھا ہے نا جو امتحانوں کے سلسلے ختم ہو جائیں گے اور میں بھی ذرا سکون پا لوں گی۔ بڑا لمبا سفر طے کیا ہے میں نے۔ اب بہت تھک گئی ہوں۔" وہ بہت ہی تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "میرا علاج تو اب صرف موت ہے۔"

کتنا درد پنہاں تھا اس کے لہجے میں۔ چندن چپ سی ہو گئی۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ

اس کی ماں دکھی ہے۔ لیکن وہ اس بات سے واقف نہ تھی کہ وہ کون سا روگ تھا جو اس کی جان کو لگا ہوا ہے۔

گلاب چائے کی پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھ کے جا چکی تھی۔ چندن نے نگاہیں اٹھا کے ماں کو دیکھا۔

"چندن! وہاں تم کس کس سے ملی تھیں؟" صاحبہ نے بہت ہی آہستگی سے سوال کیا۔

"کہاں .....؟" وہ نہ سمجھنے والے انداز میں ماں کو دیکھنے لگی۔

"عقیل ہاؤس میں۔"

"وہاں سبھی سے ملی تھی۔ سوائے عقیل صاحب کے۔" چندن کے تصور میں چھم سے علی آ گیا۔

"سب سے....." صاحبہ خود کلامی کے سے انداز میں گویا تھی۔

"ممی! وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے۔ ان کے گھر جا کر مجھے پتہ چلا کہ گھر کسے کہتے ہیں۔ رشتے کیا ہوتے ہیں۔ اپنائیت اور محبت کس جذبے کو کہتے ہیں۔ عرشیہ، زیب، زوبیہ سب کتنی اچھی ہیں جن کو گھر کی چار دیواری کا تحفظ ملا ہے۔ ممی! وہاں ان لوگوں کے درمیان رہ کر مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں کتنی بے مایہ لڑکی ہوں۔ میرا وجود کس قدر غیر اہم ہے۔ ان کے گھر جا کے مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا اور بہت شدت سے ہوا کہ کاش میرا بھی کوئی گھر ہوتا۔ نام ہوتا۔ چار دیواری کا تحفظ ہوتا۔ اے کاش کہ میرے پاس یہ بینک بیلنس نہ ہوتا، یہ تعلیم نہ ہوتی، یہ آسائشیں نہ ہوتیں لیکن میرے پاس مضبوط چھت ہوتی۔ میرے باپ کا کوئی نشان نہیں ہے۔ میری ذات ادھوری ہے۔ کاش میرے نام کے آگے باپ کے نام کا خانہ خالی نہ ہوتا ..... میرا باپ ہوتا ..... میرا باپ ..... میرا محافظ ..... میرا سائبان ..... میرے حلال ہونے کا جائز گواہ ..... میں اپنے چھوٹے سے گھر، اپنے آنگن میں بچی خوشیاں سمیٹتی۔ اس معاشرے میں عزت کے ساتھ جینے کا حق، پہچان پا سکتی اور اس گھر میں، میں ہزار بار مری اور پھر مر کے زندہ ہوئی ہوں۔ میرا احساسِ محرومی، احساسِ کمتری بڑھا ہے۔ میرا درد زیادہ ہوا ہے ممی! میرے باپ کا نام تو کم از کم بتا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دو۔"

حسرت و چاہت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں وہ کہہ رہی تھی لیکن آخری سوال بہت ڈرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا کہ کہیں اس کی ماں کے منہ سے وہ اذیت ناک "سچ" نہ نکل جائے کہ جسے سننے کے بعد وہ موہوم سی امید جو اس کے اندر جاگی تھی، دم توڑ دیتی۔ صاحبہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی پھول جیسی بیٹی جس کی روح زخم زخم تھی، کیسی پُر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ صاحبہ نے اس کے سر پر ہولے سے ہاتھ پھیرا۔

"تمہاری پیدائش کوئی دھبہ نہیں ہے، کوئی گالی نہیں ہے۔ تمہاری پیدائش حلال ہے۔ تمہارے باپ نے نکاح کیا تھا مجھ سے۔ تمہاری رگوں میں ایک شریف خاندان کا لہو گردش کر رہا ہے۔ تم بے نشاں نہیں ہو چندو۔ تم بے نشاں نہیں ہو۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں ٹھہر ٹھہر کے بتا رہی تھی اور چندن کو محسوس ہوا کہ جیسے ایک دم سے وہ جلتے سورج کی آگ برساتے ریگستان سے کسی ٹھنڈے سایہ دار نخلستان میں آ گئی ہو۔ فرحت بھرے ٹھنڈے جھونکے کا احساس ہوا تھا اس کو۔ ڈھیروں اطمینان اس کے اندر اتر گیا تھا۔ پہلی بار اس فخر کا احساس ہوا تھا کہ ہاں۔ وہ بے نشاں نہ تھی ..... وہ بھی دنیا میں سر اٹھا کے جی سکتی ہے۔

"مگ ..... کیا نام ہے میرے باپ کا؟" نہایت بے تابی سے سوال کیا۔

"بتا تو دوں لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے اور میں اس وقت کے انتظار میں ہوں جب "وہ" میرے سامنے آئے گا اور میں چندن کو اس کے سامنے لا کھڑا کر دوں گی اور اسے بتاؤں گی کہ دیکھ ..... اے آدم کے بیٹے دیکھ ..... ! تیری اِک ذرا سی بے وفائی نے میری کوکھ میں انگارے بھر دیئے ہیں۔ میری راہ کو خاردار کر دیا ہے۔ میری زندگی کو ایک گالی بنا دیا ہے ..... تیرا کیا دھرا ..... تیرے اعمال کی سزا میری معصوم بچی کو مل رہی ہے۔ سب اس کے سامنے آ رہا ہے ..... جو تم نے بویا وہ تمہاری بیٹی کاٹ رہی ہے۔ ظلم تم نے ڈھایا اور سزا اس بے قصور کو مل رہی ہے۔ تمہارے ظلم کی داستاں ہم ماں بیٹی کے چہروں پر رقم ہے۔ ہماری روحیں زخم زخم ہیں۔ ہمارے دلوں میں برچھیاں اتری ہوئی ہیں۔ تمہاری ذرا سی خود غرضی اور سنگدلی نے تمہاری ہی نسل کو تباہ

کر دیا۔ تم اپنی ہی بیٹی کے قصور وار ہو ..... مجرم ہو ..... وہ آج تمہارا پوچھ رہی ہے اور میں اسے تمہارے نام سے واقف نہیں کرا سکتی۔ میں بتاؤں گی ضرور، مگر تب جب یہ تمہارے روبرو ہو گی۔ تب تم اس کی اصلیت جان کر یہ سمجھ سکو گے کہ جب دل جلتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔

"ممی ....." چندن کی آواز پر وہ چونک سی گئی۔ وہ اپنا سوال دہرا رہی تھی۔

"چندن! ابھی کچھ نہ پوچھو ..... ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتی ..... کچھ اور انتظار کرو ..... میں تمہیں تمہارے باپ سے ملوا دوں گی۔ لیکن تم مجھ سے پھر یہ نہیں پوچھو گی۔" صاحبہ کا لہجہ نجانے کیوں ایک دم ہی تلخ ہو گیا تھا۔ اس کا قطعی انداز دیکھ کر چندن چاہنے کے باوجود کچھ نہ پوچھ سکی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بچی بچی بتائیں خالہ! جب خالو کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی تھی تب آپ کی عمر کتنی تھی؟" جب چوتھی مرتبہ علی نے یہی سوال گھما پھرا کے کیا تو خالہ چڑ گئیں۔

"اے میاں! کتنی بار پوچھو گے یہی سوال اور کتنی مرتبہ بتاؤں گی تمہیں میں کہ جب شادی ہوئی تھی میری، تب میری عمر صرف بارہ سال تھی۔

"لیکن میں کیسے مان لوں؟ کوئی تو ثبوت پیش کریں۔" علی ہنوز انہیں چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے تیرے ماننے یا نہ ماننے سے۔" خالہ بولیں۔

"جی ہاں ..... اب تو ہو چکا، جو ہونا تھا۔" کامران نے لقمہ دیا۔

"اور یہ تم نے کیا کہا ہے پیش کرنے کو؟" خالہ نے پوچھا۔

"ثبوت مانگ رہے ہیں بھائی۔" زوبیہ نے جواب دیا۔

"کیسا ثبوت میاں؟" خالہ حیرت سے بولیں۔

"شادی کا۔" کامران چھالیہ کترتے ہوئے بولا۔

"اپنے دادا سے پوچھو بیٹا! میری شادی میں شہ بالا بنے تھے۔" خالہ نے پان چباتے ہوئے کہا۔

"ہو ہو ..... بھئی بڑا پکا ثبوت ہے یہ تو۔ اب تو ماننا ہی پڑے گا۔ انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔ منہ ہی بند کروا دیا خالہ آپ نے تو۔" علی سر ہلاتے ہوئے بولا گویا مجبوراً اس بات کو تسلیم کر رہا ہو۔

"اچھا خالہ یہ بتائیں کہ خالو نے اپنی بارات پر کیا پہنا تھا؟" زیب نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

"ظاہر ہے، کپڑے پہنے ہوں گے۔" علی نے خالہ کی جگہ فوراً جواب دیا۔

"آپ چپ رہیں۔ میں خالہ سے پوچھ رہی ہوں۔ بتائیں نا خالہ۔"

"انہوں نے پہنا تھا سفید پائجامہ اور سنہری شیروانی، سر پر سہرا اور....." خالہ بڑے جذب کے عالم میں بتا رہی تھیں کہ کامران نے لقمہ دیا۔

"ہاتھ میں لال رومال۔"

"بالکل صحیح۔" خالہ جھٹ بولیں۔

"بڑی گہری نظروں سے مشاہدہ کیا تھا خالہ نے۔" زوبیہ ہنسی۔

"اور آپ نے کیا پہنا تھا؟" عثمان نے پاپ کارن کھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے پہنا تھا بھیا....."

"لال، نیلا، پیلا جوڑا۔" کامران کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی اور اس بار خالہ نے گھور کے اسے دیکھا۔

"تم پھر بولے۔"

"کیا کرے خالہ۔ اس بے چارے کی زبان میں کھجلی ہوتی ہے بار بار۔" عرشیہ نے کہا۔

"افوہ ..... بھئی تم لوگ چپ رہو نا، خالہ کو بولنے دو۔ جی خالہ اب فرمائیں۔" علی نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا اور یوں خالہ کی طرف متوجہ ہو گیا جیسے اس سے زیادہ اہم بات کوئی نہ ہو۔

"جی جی ..... بتا دیں خالہ۔ یہ اپنی دلہن کے لئے بھی ویسا ہی بنوائیں گے۔" زیب نے علی کو چھیڑنے کا موقع نہ گنوایا۔

"بالکل، بالکل ..... بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ پہننے کے لئے۔" علی برجستہ بولا تو زیب کا رنگ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو گیا جبکہ سبھی لڑکے لڑکیاں معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

"منہ دھو رکھئے۔" زیب جھنا کے بولی۔

"قسم لے لو، روزانہ نہاتا ہوں۔ یقین نہ آئے تو پوچھ لو ہوا سے۔ کیوں ہوا؟" علی نے ایک طرف بیٹھی ہوا سے پوچھا جو نجانے کس دھیان میں **تیز** بڑے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"دیکھا....." گواہی مل جانے پر علی نے اپنی آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔

"اُفوہ..... خدا کے لئے اب لڑنے نہ بیٹھ جانا۔ خالہ! آپ بتا رہی تھیں اپنے شادی کے جوڑے کے بارے میں۔" عرشیہ نے بیچ میں بول کر لڑائی کو طول دینے سے روکا۔

"ہاں ..... مجھے آج بھی یاد ہے اپنی شادی کا جوڑا..... ہاہ... ہا۔" خالہ کو شاید اپنی شادی کی رات یاد آ گئی تھی۔ بڑی ہی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"کیوں خالہ! کیا بہت برا تھا؟" عاصمہ معصومیت سے بولی۔

"ارے ہٹو ..... برا کیوں ہوتا؟ ارے سہاگ کا جوڑا تو نصیب والیوں کو پہننا نصیب ہوتا ہے۔ چاہے کم قیمت ہی ہو، سہاگنوں کے لئے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہزاروں ارمان چھپے ہوتے ہیں۔" خالہ ایک جذب کے عالم میں بتا رہی تھیں۔

"جوڑے میں.....؟" کامران نے بڑی حیرت سے پوچھا۔ خالہ کو مداخلت پسند نہ آئی تو اپنے موٹے عدسوں والے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورنے لگیں۔

"سوری ..... سوری....." کامران نے جھٹ کان پکڑ لئے۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ پہلے زمانے میں تو دلہنوں کو بڑی ہی سادگی سے تیار کیا جاتا تھا۔ لال گوٹے کناری والا چم چم کرتا جوڑا پہنایا، دھلا دھلایا چہرہ، نہ میک اپ شیک اپ، نہ تھوپا تھاپی۔ بس دنداسہ لگایا، سرمے کی دو لکیریں کھینچیں، کس کے چٹیا بنائی، چند ایک زیور پہنائے اور بس ہو گئی دلہن تیار۔ میں بھی ایسے ہی بنی تھی دلہن۔ یہ لال سرخ جوڑا تھا میرا۔ اور کناری تو اتنی نفیس کہ مت پوچھو۔" خالہ بتا رہی تھیں۔

"سچ خالہ ..... پہلے دلہنیں ایسے تیار ہوتی تھیں؟" عرشیہ بڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تو اور کیا..... اے آج کی طرح تھوڑا کہ موئی دکان میں چلی جاتی ہیں۔ نجانے کیا الاپ شلاپ ملتی ہیں چہروں پر کہ شکلیں ہی بدل جاتی ہیں۔ ارے لاکھوں روپے اُڑا دیتی ہیں۔ ارے دُلہن کا اصل روپ رنگ ہی چھپ جاتا ہے۔" خالہ بولیں۔

"دکان نہیں خالہ! پارلر۔" عاصمہ نے جلدی سے تصحیح کی۔

"ارے میری بلا سے، کچھ بھی ہو۔" خالہ مکھی اُڑانے کے سے انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا خالہ! کیا آپ کے زمانے کی دلہنیں بہت اچھی ہوتی تھیں؟" زیب اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

"ارے بی! کیا پوچھتی ہو ہمارے دور کی دلہنوں کا۔ کیا حیا دار، کیسا لجایا ہوا روپ ہوتا تھا۔ ارے مہینوں تو گھونگھٹ ہی نہ اٹھاتی تھیں۔ کیسا نورانی چہرہ ہوتا تھا۔ جبکہ آج کی لڑکیاں۔ توبہ توبہ، نہ شرم نہ حیا..... عجیب بے حیائی کا دور ہے بھئی۔" خالہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

"ضرور اشعر کا فون ہو گا خالہ! میرے آنے تک ذرا اپنا سلسلہ کلام منقطع رکھئے گا۔ فون سن کر میں ابھی آتا ہوں۔ پھر آپ کے دور کی دلہنوں پر تبصرہ سنوں گا۔ ٹھیک ہے۔" علی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور چھپاک سے باہر نکل گیا۔

"کیا گدھے انسان ہو تم بھی یار! کب سے فون کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا سوکھ رہا ہوں۔ کہاں غائب تھے؟" ریسیور اٹھاتے ہی وہ شروع ہو گیا اور اس کی آواز پہچان کر چندن کا دل زور سے دھڑکا۔

"میں چندن بول رہی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور علی نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ "لعنت ہو بے وقوف بندے۔ احمقوں کی طرح شروع ہو گئے۔ کیا سوچتی ہو گی وہ۔" اس نے خود پر لعنت بھیجی۔

"اوہ سوری ..... میں سمجھا اشعر کا فون ہے۔ دراصل اس نے اسی وقت فون کرنے کو کہا تھا۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔

"کوئی بات نہیں علی صاحب! کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"پہچان گئیں آپ۔ کمال ہے۔ بڑی اچھی یادداشت ہے۔ ورنہ آج کل اتنی نیمد لوگوں کو یادداشت کی خرابی کی شکایت رہتی ہے۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"کچھ چہرے، کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں کہ تا حیات انسان کی یادداشت میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

محفوظ رہ جاتی ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی معنی خیز بات اس کے منہ سے نکل گئی اور علی چونک سا گیا۔

ادھر چندن نے اپنی زبان دانتوں تلے دے دی۔ ''مجھے آپ کے فادر سے بات کرنی تھی۔ کیا اس وقت وہ گھر پر ملیں گے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''اس وقت تو وہ ہاسپٹل میں ہوں گے۔ آپ چاہیں تو ان کو وہاں فون کر سکتی ہیں ورنہ نمبر دے دیں۔'' علی سنجیدگی سے بولا۔

''نہیں ..... مجھ کو خود ہی بات کرنی تھی۔ آپ ہسپتال کا نمبر لکھوا دیں۔'' اور علی نے نمبر لکھوا دیا۔

''تھینک یو..... اور باقی سب کیسے ہیں؟'' نمبر لکھنے کے بعد چندن نے پوچھا۔

''مزے میں ہیں۔''

''نانی کیا کر رہی ہیں؟''

''وہ ابھی ابھی ہمیں اپنی شادی کے قصے سنا رہی تھیں۔''

''اچھا ..... خوب رونق لگا رکھی ہو گی۔'' وہ مسکرائی۔

''جی ہاں''

''آپ اچھے ہیں؟'' چندن نے اس کا حال پوچھا۔

''بہت اچھا ہوں۔'' علی نے شوخی سے جواب دیا تو وہ ہنس دی۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' وہ برجستہ بولی تو علی سر کھجانے لگا۔

''ویسے اتنی دور سے اتنی لمبی کال کرنے کا نتیجہ ذرا برا بھی نکل سکتا ہے۔'' علی کا اشارہ بل کی طرف تھا۔

''نتیجے کی پرواہ کسے ہے۔'' وہ بے ساختہ ہی بول گئی لیکن پھر اپنے ہونٹ بھینچ لئے جبکہ علی اس کی معنی خیز بات پر ایک بار پھر چونک گیا۔

''اچھا ..... مجھے اجازت دیں۔ خدا حافظ۔'' چندن نے فون بند کر دیا اور علی چند لمحے ریسیور ہاتھ ہی میں پکڑے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ لیکن پھر جلد ہی سر جھٹک کر ریسیور کریڈل پر رکھا اور کمرے میں واپس چلا آیا۔

''کس کا فون تھا؟'' عرشیہ نے پوچھا۔

''خالہ کی نواسی کا۔'' علی، خالہ کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولا اور زیب لاشعوری طور پر چونک گئی۔

''چندن کا فون تھا..... کیا کہہ رہی تھی؟'' خالہ نے پوچھا۔

''کہہ رہی تھی کہ خالہ کے بغیر میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا ہے۔ مجبوراً ان کی تصویر سامنے رکھ کے کھانا کھاتی ہوں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''جیسے خالہ نہ ہوئیں، ہاضمے کا چورن ہو گئیں۔'' کامران نے ٹکڑا لگایا تو سارے لوگ کھی کھی کرنے لگے۔

''اے ہٹو۔ بڈھی خالہ سے ٹھٹھول کرتے ہو۔ لگاؤں گی شکایت تم دونوں کے باپوں کو۔''

''اللہ اللہ کریں خالہ۔ یہ عمر آپ کی شکایت لگانے کی نہیں ہے۔'' علی بولا۔

''شکایت لگانے کی کوئی عمر مقرر نہیں ہوتی بیٹا۔'' خالہ برجستہ بولیں تو وہ مسکرانے لگا۔

''اب بتا بھی دے کیا کہہ رہی تھی چندن؟ کہیں صاحبہ کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی؟'' خالہ کا ذہن اسی طرف تھا۔

''صاحبہ کون؟'' کامران نے پوچھا۔

''چندن کی ماں کا نام ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''بڑا خوبصورت نام ہے۔'' عرشیہ بولی۔

''ارے صرف نام ہی نہیں، خود بھی بہت خوبصورت تھی صاحبہ۔ بالکل پریوں جیسی۔ چندن کا حسن تو کچھ بھی نہیں ہے ماں کے مقابلے میں۔'' وہ بتا رہی تھیں۔

''کیوں ..... کیا اب خوبصورت نہیں ہیں؟'' عرشیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کہاں بچی! فلوں نے ختم کر دیا ہے اس شہزادی سی لڑکی کو۔ کنول کنول کے ختم ہو گئی ہے۔ ارے ایسی حسین ہوا کرتی تھی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائے۔ پانی پیتی تو حلق سے اترتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ بالکل موتیوں جیسی تھی وہ۔ لیکن افسوس وہ اس کی قدر نہ کر سکا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔

''وہ کون؟'' سب چونک گئے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ارے وہی ..... اس کا خاوند، بے قدرا ..... ہرجائی ..... ہیرے کی قدر نہ کی اس نے۔ بہت پچھتائے گا۔"

"آپ کا کیا لے کر بھاگا ہے وہ؟" علی نے گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میرا کیا لے کے بھاگتا۔ صاحبہ کو ہی خالی ہاتھ، خالی دامن کر گیا۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔

"کب سے جانتی ہیں آپ ان کو؟" علی نے صاحبہ کے متعلق پوچھا۔

"بہت عرصہ ہو گیا ہے میاں۔"

"ان کے شوہر نے ان کو کیوں چھوڑ دیا؟" وہ نجانے کیوں اس کے بارے میں متجسس ہو رہا تھا۔

"بیٹا! ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔ مگر ایک عام آدمی ہیرے کو عام سا پتھر ہی سمجھتا ہے۔" خالہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اور تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے شاہ صاحب کے مزار پر کب لے جا رہے ہو؟ کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں، ہمیشہ بہانے بنا کے ٹال جاتے ہو۔" خالہ نے اچانک ہی موضوع بدلا اور علی سمجھ گیا کہ وہ مزید اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ سو اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

"آج ہی چلیں گے۔" وہ بولا۔

✲

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے
پھر کاگا بولا گھر کے سُونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی، تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے تم یاد آئے

کمرے کی اداس فضا کو نیرہ نور کی پُرسوز آواز مزید یاسیت سے بھرپور بنا رہی

تھی۔ وہ ایزی چیئر پر آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ صاحبہ اندر داخل ہوئی تو اسے اس پوزیشن میں دیکھ کر چونک گئی۔

"چندو.....!" اس نے پکارا اور چندن ایک دم آنکھیں کھولتی ہوئی سیدھی بیٹھ گئی۔

"ممی ..... آپ؟" اس نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کر دیا۔

"کیا کر رہی تھی؟" صاحبہ صوفے میں دھنستی ہوئی پوچھنے لگی۔

"جی ..... بس یونہی میوزک سن رہی تھی۔" وہ اپنے بکھرے بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے بولی۔

"اتنا اداس گیت کسی کی یاد میں ہی سنا جاتا ہے۔" صاحبہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ لمحہ بھر کو تو وہ گڑبڑا گئی۔

"نہیں ممی! ضروری نہیں۔ بس موڈ پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔" وہ سنبھل کے بولی۔

"اس اداس موڈ کی وجہ کون ہے؟" صاحبہ کی ٹٹولتی نظریں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

"اوہو ممی.....! وہم ہو گیا ہے آپ کو۔ اچھا یہ بتائیں کہ تیاری تو ساری مکمل ہے نا..... کل ہمیں کراچی روانہ ہونا ہے۔" اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں ..... ہو چکیں سب تیاریاں۔" صاحبہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"اچھا ..... میں ذرا فلائٹ ایک بار پھر چیک کر لوں کہ وقت پر ہے بھی یا نہیں۔ آج کل جہاز اور ٹرین میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ دونوں ہی مقررہ وقت سے لیٹ روانہ ہوتے ہیں۔" چندن کہتی ہوئی جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور صاحبہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ جو تحریر وہ اس وقت پڑھ رہی تھی اس کے چہرے پر وہ اسے بہت کچھ سوچنے، سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

✲

ایک بار پھر وہ اسی شہر میں موجود تھی جہاں اس نے اپنا دل ہارا تھا۔

ہاتھ الجھے ہوئے دھاگے میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جُدا کس سے کریں؟

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ٹاپ فلور پر بنے اپنے سپر لگژری اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں کھڑی چندن باہر چنچل چنچلاتی کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی سمندر کی بپھری ہوئی لہریں دیکھ رہی تھی۔

کراچی آتے ہی صاحبہ کو فوراً ہی ہسپتال ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ وہ گلاب کے ساتھ اپنے اس ذاتی فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ سوچوں کا مرکز ایک ہی ہستی تھی۔

'کاش میں تمہیں پا سکتی۔' بڑی ہی حسرت سے اس کے دل نے خواہش کی۔

''ٹرن..... ٹرن..... ٹرن.....'' فون کی گھنٹی بجی تو وہ اپنے خیالوں کے بھنور سے باہر نکلی۔

فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید گلاب فون اٹھا لے مگر وہ شاید بہت مصروف تھی۔ مجبوراً اسے ہی ریسیو کرنا پڑا۔

''یس.....'' بیزاری سے اس نے کہا۔

''شکر ہے کہ جناب کی آواز سننے کو ملی۔ ترس گیا تھا حضور کی آواز سننے کو۔'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری اور چندن کی شفاف پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''اوہ..... بخش صاحب! آپ نے یہاں بھی ڈھونڈ ہی لیا ہمیں۔'' ناگواری کو چھپاتے ہوئے وہ خود کو کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

''اجی ہم تو بل بل کی خبر رکھنے والوں میں سے ہیں۔'' بخش ہنسا۔

''وہ تو ہے۔ مگر یہ بتائیں کہ یہاں ہماری آمد کی خبر کس نے دے دی ہے؟''

''آپ کے گھر فون کیا تھا۔ ملازم سے پتہ لگا تھا کہ آپ کی ممی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ سوہم نے سوچا کہ فون کر کے خیریت ہی پوچھ لیں۔''

''جی ہاں..... ممی کی طبیعت ذرا خراب ہے اور میں ابھی ہسپتال کے لئے ہی نکل رہی تھی۔ آپ کے فون کرنے کا بہت شکریہ۔'' اس نے کہا۔ جھوٹ بولنا مجبوری تھی کہ یہ شخص گوند کی طرح چپک گیا تھا۔

''اچھا..... ہم نے تو سوچا تھا کہ آج کی شام آپ کے ساتھ منائیں گے۔ مگر آپ کا تو پروگرام ہی کچھ اور نکلا۔''

''سوری بخش صاحب! آج تو بالکل وقت نہیں ہے۔ میں ممی کے پاس ہی رہوں

گی۔ کسی اور دن کا رکھ لیں گے۔ اس وقت مجھے ذرا جلدی بھی ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے..... پھر آپ کے ساتھ پروگرام سیٹ کر لیں گے۔ کچھ دنوں بعد یہاں میوزیکل پروگرام ہونے والا ہے۔ بہت بڑے بڑے سنگر آئیں گے۔ میں ٹکٹ لے لوں گا۔ اکٹھے چلیں گے۔ ملاقات بھی ہو جائے گی اور ہمیں مہمان نوازی کا شرف بھی مل جائے گا۔ ہمیں بہت جلدی ہے ملنے کی کہ انتظار کے لمحے بہت کٹھن لگ رہے ہیں۔'' وہ بہت ہی پیار بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

''جی ٹھیک ہے..... چلیں گے۔'' اس نے بیزاری سے حامی بھر لی۔

بخش اس کا امیدوار تھا اور شادی کے لئے پیغام دے چکا تھا لیکن چندن، صاحبہ کو بتا چکی تھی کہ بخش جیسے وڈیرے سے ہرگز شادی نہیں کرے گی۔

اس نے اپنے بالوں میں جلدی جلدی برش پھیر کر جوڑا بنایا اور ایک نظر اپنے لباس پر ڈالی۔ قدرے مطمئن ہو کر اس نے پرس اٹھایا اور کمرے سے نکل آئی۔ گلاب کچن میں مصروف تھی۔

''گلاب! میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ واپسی شاید کافی لیٹ ہو۔ تم کھانا کھا لینا۔ اور سنو! میرا کوئی فون آئے تو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں سمجھیں۔'' وہ ہدایت دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ تو اس سے نہ ملنے کی دعائیں کر رہی تھی مگر یہ کیا ہوا کہ اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس سے ملاقات کی خواہاں تھی جو وہ آ گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا خواہشیں یوں بھی پوری ہو جاتی ہیں.....؟ آنکھیں جس کی دید کو ترس رہی تھیں۔ دل جس کی قربت کے لئے تڑپ رہا تھا وہ یوں اچانک نظر آ گیا تھا کہ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔

اس وقت صاحبہ سے ملنے کے بعد وہ جلیل احمد کے روم میں بیٹھی ان سے صاحبہ کی حالت کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ اچانک پھر ایمرجنسی ہو گئی اور جلیل احمد کو جانا پڑا۔ کسی مریض کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ چندن ان کے انتظار میں بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی کہ وہ آ گیا جس کو دیکھنے کو اس کی آنکھیں پیاسی تھیں مگر جس سے ملنے سے وہ کترا بھی رہی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اسی شخص سے وہ کتراتی بھی تھی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جس کو ساری عمر سامنے بٹھا کر دیکھتے رہنے کو من کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے تو وہ عقیل ہاؤس بھی نہ گئی تھی۔

''اوہ، آپ ..... کیا دلچسپ اتفاق ہے۔ میں یہاں ابو سے ملنے آیا تھا اور ملاقات ہوگئی آپ سے۔ کیسی ہیں؟'' وہ عادتاً مسکرا کے خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

'کیا پوچھتے ہو میرا حال ..... تم سے ملنے سے پہلے زندہ تھی۔ اب مر مر کے جی رہی ہوں۔ عذاب مسلسل سے گزر رہی ہوں۔'

اس نے سوچا پھر پلکیں جھپکا کے اسے دیکھا جو اپنی پوری مردانہ وجاہت سمیت اس کے سامنے تھا۔

''ٹھیک ہوں۔ اور آپ.....؟'' اس نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔

''فرسٹ کلاس ..... مدر کیسی ہیں آپ کی؟'' وہ جلیل احمد کی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''اچھی نہیں ہیں۔ حالت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ رہی ہے۔ آپریشن ہوگا۔'' وہ افسردگی سے بتانے لگی۔

''اوہ ..... ویری سیڈ۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔ وہ ضرور سنے گا۔'' علی سنجیدگی سے بولا۔

''کبھی کبھی دعائیں بھی بالکل رائیگاں چلی جاتی ہیں۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ پھر آپ جیسی باہمت اور مضبوط لڑکی کے منہ سے مایوسی کی باتیں سن کر اچھا نہیں لگتا۔'' وہ مسکرایا اور چندن نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

''وقت اور حالات کے طوفان میں جب انسان پھنس جاتا ہے تو اسے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی ذات کو مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ علی صاحب! اگر میرے سر پر بھی عرشیہ، زوبیہ کی طرح کوئی مضبوط سائبان ہوتا، کوئی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تو شاید میں ایسی نہ ہوتی جیسی آج ہوں۔ لیکن میرے پاس کوئی مضبوط سہارا نہ تھا، نہ ہے۔ اپنی زندگی کی ناؤ کو اپنی ہی طاقت کے بل بوتے پر کنارے لگانا ہو گا۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''علی صاحب! کبھی کبھی جب بہت

تھک جاتی ہوں تب ایسے سہارے کی بہت شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے کاندھے پر میں اپنی مصیبتوں کے بوجھ رکھ کر خود کچھ دیر کو سستا لوں۔ کبھی کبھی بہت جی کرتا ہے کہ کوئی ہو جو اس خاردار راستے کو صاف کر کے میرے لئے پھول ہی پھول بچھا دے۔ میرے زخموں پر اپنے پیار کا مرہم رکھے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ وہ سب کچھ جو اس کے دل میں تھا۔ نجانے کیوں؟ لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا ہر زخم اسے دکھائے۔ وہ اپنے ہر دکھ میں اسے شریک کرے۔ اس کو اپنی روح کے زخم دکھائے۔

''آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟'' وہ اس کے درد و غم کی کہانی سن کر کچھ دیر کو چپ سا ہو گیا تھا، اچانک بولا۔ بہت ہی پُرخلوص انداز میں اپنا مشورہ پیش کر دیا۔

''شادی.....'' چندن کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا

''ہاں ..... اس طرح سے آپ کو ایک غمگسار ساتھی، ایک درد مند دوست مل جائے گا۔ آپ کو سہارا مل جائے گا۔ آپ کی تنہائیاں بانٹنے والا آ جائے گا۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے آپ کو، ہر طرح سے مکمل اور با عزت زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی بھی شریف خاندان کا لڑکا آپ کو اپنانے میں فخر محسوس کرے گا۔'' وہ تو اپنی دانست میں اسے نیک اور اچھا مشورہ دے رہا تھا لیکن جو چندن کے دل پر گزر رہی تھی اس سے وہ بے خبر تھا۔

''ابو آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں آپ جیسی لڑکیاں ہی قابل فخر ہوتی ہیں۔ بنا کسی مرد کے تحفظ کے جس طرح آپ ایک عزت دار زندگی گزار رہی ہیں وہ قابل تعریف ہے۔'' علی کہے جا رہا تھا اور اس کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ تازیانے کی مانند اسے لگ رہا تھا۔ برچھی بن بن کے سینے میں پیوست ہو رہا تھا۔

با عزت، با حیا، قابل تعریف ..... جیسے علی نے کس کے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔ اس کی قوت برداشت کی انتہا ہو گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

''بس کریں علی صاحب! چپ ہو جائیں۔ کوئی حق نہیں پہنچتا ہے آپ کو میرے زخموں کو ادھیڑنے کا۔'' وہ چلا اٹھی اور علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''جی.....؟''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں پہلے ہی کم عذاب میں تھی جو آپ نے مجھے اور دکھی کر دیا۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"مم ...... میں ...... کیا مطلب؟" وہ ہراساں و پریشان اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے جس سے چندن کا دل دُکھا ہے۔ اس کا قصور کیا ہے؟ علی چپ چاپ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

❋

وہ صاحب کے پاس بیٹھی اسے اپنے ہاتھوں سے سُوپ پلا رہی تھی۔ صاحب بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کیسا پھیکا پھیکا اور اُداس چہرہ تھا اس کا آج۔

"چندو! پریشانیاں اور دکھ اگر شیئر کر لئے جائیں تو اس سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔" کافی طویل خاموشی کے بعد اس نے دھیرے سے کہا تو وہ چونک کر ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

"میں جانتی ہوں ...... کوئی بات ہے جو تم کو اتنے دنوں سے پریشان کر رہی ہے۔ پہلے اس لئے نہیں پوچھا کہ شاید تم خود ہی کچھ بتا دو۔ اب میں پوچھ رہی ہوں تو بتا دو آخر تمہیں کیا پریشانی ہے؟" وہ نرمی سے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں ممی ......! مجھے بھلا کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ یوں بھی پریشانیاں تو جیتے جاگتے انسانوں کو ہوتی ہیں، مُردوں کو نہیں۔" خالی باؤل ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"چندو! میری بچی ...... ماں سے کچھ نہیں چھپاتے۔ اپنا ہر غم، ہر پریشانی اس کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں بیٹی! بتا دو، یوں گھٹ گھٹ کے جینے سے تمہیں بھی دکھ ہو گا اور مجھے بھی چین نصیب نہ ہو گا۔"

صاحب اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے بولی اور اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ ماں کے سینے میں سر چھپا کے وہ تڑپ تڑپ کے رو دی۔ صاحب نے اسے رونے دیا۔ روکا نہیں۔ بس اس کے گھنیرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ نجانے کتنے دنوں کا غبار تھا ...... کب کا لاوا پک رہا تھا اس کے اندر ...... ماں کی شفقت بھری چھاؤں

میں آئی تو جیسے ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ گیا۔ دل کا بوجھ ختم نہ ہوا لیکن کم ضرور ہو گیا۔ وہ کچھ پُرسکون ہو گئی تھی۔ آنسو اگر پلکوں کے بند توڑ کے باہر نہ نکلیں تو دل کا زہر بن جاتے ہیں۔ جاں کا روگ بن جاتے ہیں۔ لیکن آنسوؤں کے اس سیلاب کو جب باہر نکلنے کی راہ ملجاتی ہے تو وہ پھول کی طرح ہلکا ہو جاتا ہے۔

قدرے پُرسکون ہونے کے بعد وہ ماں سے الگ ہوئی۔ ماں ...... جو اولاد کو جنم دیتی ہے۔ اپنا لہو پلا پلا کر اس ننھے سے پودے کو سینچتی ہے۔ کلی کو پھول اور پودے کو تن آور درخت بناتی ہے۔ اس کی ایک ایک ادا سے واقف ہوتی ہے، ایک ایک بات کو جانتی ہے۔ چاہے بچہ زبان سے بولے نہ بولے وہ سب سمجھتی ہے۔ اس کی تکلیف کو، اس کے دکھ کو، اس کی پریشانی کو اور اس کے صدمے کو۔ وہ خوش ہے تو کیوں ہے، اس کی آنکھیں ہنس رہی ہیں تو کیوں؟ اس کے لب مسکرا رہے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے، وہ چہرے سے حال دل جان جاتی ہے۔ تبھی تو ماں کو قدرت کا انمول تحفہ کہا گیا ہے کہ اس کا نعم البدل ہی کوئی نہیں۔ بچہ جب حالات کی تند و تیز لہروں کا شکار ہو جاتا ہے، مقابلہ کرتے کرتے اس کے بازو شل ہو جاتے ہیں تب یہ ماں ہی کی ذات ہوتی ہے جس کی آغوش میں ستانے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر تازہ دم ہو کر اپنے اندر مقابلے کا جذبہ پھر سے زندہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ دکھ چاہے کتنا بڑا ہو، ماں کے سینے سے لگ کر اس کا بوجھ کم ہونے لگتا ہے۔

چندن ماں سے کچھ نہ چھپا سکی۔ سب کچھ بتا دیا۔ عقیل ہاؤس میں علی سے ملاقات، اس سے محبت کرنے کی حماقت، جو وہ ہے، اپنی اصلیت بتا دینے کے بعد اس کا ری ایکشن۔

"محبت انسان جان بوجھ کر نہیں کرتا ہے چندو! یہ تو بڑا اچانک اور قدرتی عمل ہوتا ہے کہ کوئی انسان کسی کو پسند آ جاتا ہے اور پھر پسند کا یہی جذبہ جب آگے بڑھتا ہے تو محبت میں بدل جاتا ہے۔ انجام کی پرواہ کئے بغیر کہ محبت کا انجام تو بس آنسو ہیں۔ آہیں ہیں، پچھتاوے ہیں، یادیں رہ جاتی ہیں جو دکھ دیتی ہیں، رُلاتی ہیں۔ یہ روگ تو جان لیوا ہوتا ہے۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

'جو غلطی میں نے کی تھی اب میری بچی وہی غلطی کرنے جا رہی ہے ...... میں جو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اپنی غلطی کی پاداش آج تک بھگت رہی ہوں، ابھی تک شعلوں کی زد میں ہوں۔ اللہ! یہ نادان لڑکی کیا کر بیٹھی......' صاحب نے کربناک نگاہوں سے اوپر دیکھا۔

"آج اگر میرا کوئی مضبوط سہارا ہوتا تو میں انہیں پا لیتی مگر اب تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں انہیں انگاروں پر نہیں چلا سکتی۔" وہ رو رہی تھی اور صاحب نے اپنے لب بھینچ لئے۔

"چندن! ایک کام کرے گی میرا؟" کچھ دیر بعد صاحب بولی۔

"کیا......؟" چندن نے سر اٹھا کے دیکھا۔

"خلیل احمد کو بلا لاؤ۔"

"کیا......؟ علی کے چچا کو......؟" وہ چونکی۔

"کوئی سوال مت کرو...... بس اسے لے آؤ۔ ہر راز سے پردہ اٹھے گا اور اس کے سامنے ہی اٹھے گا۔" صاحب نے اتنا کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور چندن آنسو پونچھتی ہوئی اُلجھی اُلجھی سی اٹھ گئی۔ اس وقت وہ صرف یہی سوچ رہی تھی کہ اس کی ماں نے خلیل احمد کو کیوں بلوایا ہے؟ کیا رشتہ ہو سکتا ہے اس کا اس کے ساتھ؟ کیا وہ دونوں جانتے ہیں ایک دوسرے کو......؟

اور اسی ادھیڑ بن میں اس نے کسی نہ کسی طرح فون کر کے خلیل احمد کو ہسپتال بلوا لیا۔ وہ بھی حیران و پریشان تھے کہ چندن کو ان سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اور انہوں نے اس سے پوچھا بھی۔

"مجھے بھی نہیں پتہ۔ بس ممی نے کہا تھا کہ آپ کو بلوا لوں۔" وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ارے...... یہ چچا جان چندن کے ساتھ کہاں جا رہے ہیں؟" علی کی نظر دور ہی سے ان دونوں پر پڑی تو چونک گیا۔ ان دونوں کی پشت اس کی طرف تھی لہٰذا وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ چندن اور خلیل احمد دونوں اس روم میں داخل ہوئے جہاں صاحب تھی۔ جس وقت وہ دونوں اندر داخل ہوئے، صاحب بائیں کروٹ پہ لیٹی تھی۔

"ممی......" چندن نے پکارا تو وہ پلٹی۔ اس کی نگاہ پہلے چندن اور پھر چندن کے بازو میں کھڑے خلیل احمد پر پڑی جو بے یقین نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

'یہ سچ ہے یا نظر کا دھوکا...... یہ وہی ہے یا کوئی اور...... میں کیا دیکھ رہا ہوں میرے خدا......؟'

خلیل احمد پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھ رہے تھے جو ہڈیوں کا پنجر لگ رہی تھی۔ اُداس، کھنڈر جیسے چہرے پر بے نور آنکھیں۔ یہ وہ تو نہیں تھی جس پر برسوں پہلے وہ اپنا دل ہار بیٹھے تھے۔ یہ تو کوئی اُجڑی ہوئی، زندہ لاش تھی!

"کیوں خلیل احمد، پہچانا نہیں؟ میں صاحب ہی ہوں۔" صاحب کی طنزیہ آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ...... یہ تم ہو صاحب...... مجھے یقین نہیں آ رہا...... یہ تم نہیں ہو سکتی ہو۔" وہ قریب آتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے اور اندر آتے علی کے قدم خود بخود ہی دروازے کے پاس ٹھہر گئے۔

"یہ میں ہی ہوں خلیل احمد...... یقین کر لو۔ اس دوسری صاحب کے خالق...... میرا یقین کر لو......" صاحب کرب و رنج میں ڈوبی بولی۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے؟" خلیل احمد اس کے قریب آ گئے۔ جبکہ چندن کبھی ماں کو اور کبھی خلیل احمد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"میری اس حالت کے ذمہ دار بھی تم ہو خلیل احمد! تمہاری بے وفائی نے آج مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں میرا شمار مُردوں میں ہوتا ہے، زندوں میں نہیں۔" صاحب دکھ سے بولی۔

"لیکن میں تمہاری اس حالت کا ذمہ دار کیسے ہو سکتا ہوں صاحب؟ میں نے تو تمہیں آزاد کر دیا تھا۔" خلیل احمد احساس جرم سے بچنا چاہتے تھے۔

"نہیں خلیل احمد، نہیں...... تم نے مجھے آزاد نہیں کیا تھا بلکہ یوں کہو کہ شریعت کو آڑ بنا کے تم نے اپنا مطلب نکالا اور پھر جی بھر گیا تو کسی بے جان کھلونے کی طرح اٹھا کے پھینک دیا۔ لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ جس سے تم نے کھیل کھیلا، وہ کوئی بے جان کھلونا نہیں تھا بلکہ ایک جیتا جاگتا وجود تھا۔ جو تمہاری ہوس کا شکار بنا تھا وہ وجود اب راکھ بن چکا ہے۔ تم نے میری زندگی تو برباد کی سو کی مگر اپنی سگی بیٹی کی بربادی میں بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے خلیل احمد!" صاحب کہہ رہی تھی۔ اور ایک ایک لفظ بجلی بن

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر علی پر گر رہا تھا۔ کیسے بھیانک انکشافات ہو رہے تھے۔ چندن اپنی جگہ بُت بنی کھڑی تھی۔ یہ شخص ..... یہ شخص اس کا باپ تھا۔ جائز باپ ..... کیسا انکشاف تھا یہ.....

''کیا ..... کیا کہہ رہی ہو تم؟ چندن میری بیٹی.....'' خلیل احمد نے جھٹکے سے گردن موڑ کے چندن کو دیکھا۔

''ہاں خلیل احمد! بیٹی ہے یہ تمہاری ..... تمہاری عزت۔ جو در، در کی خاک چھانتی رہی۔ اور اس کی وجہ بھی تم ہو۔'' صاحبہ کرب ناک لہجے میں بولی۔

''نہیں.....'' خلیل احمد نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''کانوں پر ہاتھ رکھنے سے سچائی مٹ نہیں جائے گی۔ سنو، سچائی کو اور پھر دیکھو کہ تمہارے ایک عمل نے کس کس کو کانٹوں پر دھکیل دیا ہے۔'' صاحبہ چلائی۔

''ممی.....! مجھے بتائیں، سب کچھ بتائیں، یہ سب کیا ہے؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' چندن اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

''ہاں ..... اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں ..... ہر راز سے پردہ اٹھا دوں ..... تمہیں اس شخص کا اصلی چہرہ دکھا دوں۔ میرا تعلق مصر سے ہے ..... میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میری پرورش بہت نازوں سے کی گئی تھی۔ میری ہر خواہش کو پورا کرنا میرے والدین اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ میری سہیلی رقیہ کے بڑے بھائی کی شادی تھی۔ رقیہ میری بہت اچھی دوست تھی۔ اس لئے میں نے اس کی پوری شادی میں باقاعدگی سے شرکت کی تھی۔ یہیں میری ملاقات خلیل احمد سے ہوئی.....''

صاحبہ بتا رہی تھی اور خلیل احمد پر یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے۔

انہیں یاد تھا جب وہ اپنے بزنس کے سلسلے میں ایک دفعہ مصر گئے تھے تو اپنے ایک دوست اسد سے ملنے اس کے گھر بھی گئے تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ شادی انجوائے کر رہے تھے۔ تب اچانک ہی ان کی نگاہ آتشی گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس نازک سی لڑکی پر پڑی۔ ہنستی مسکراتی لڑکیوں کے درمیان وہ یوں لگ رہی تھی جیسے تاروں بھرے آسمان پر ایک اکیلا چاند۔

خلیل احمد کی نگاہ اس پر پڑی تو ہٹنا ہی بھول گئی۔ اتنا ملیح حُسن، اتنا حسین سراپا آج سے پہلے اس کی نگاہ سے نہ گزرا تھا۔ اور ان جیسے حُسن پرست بندے کے لئے یہ ایک خوشگوار احساس تھا۔ انہیں ساری محفل کی رونقیں اسی کے دم سے محسوس ہوئیں۔ وہ اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کرتے رہے۔

پھر قدرت نے انہیں یہ موقع خود ہی فراہم کر دیا۔ ایک جگہ وہ انہیں تنہا بیٹھی نظر آئی تو وہ وقت ضائع کرنے کی بجائے فوراً اس کے پاس پہنچ گئے۔

''ایکسکیوزمی، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' انہوں نے اس کے قریب رکھی ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ضرور.....'' وہ چونکی۔ خلیل احمد اس کے قریب ہی بیٹھ گئے اور غور سے اسے دیکھا۔ کیاریوں کے پاس بیٹھی گلابی لباس میں وہ گلاب کا کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔

''میرا نام خلیل احمد ہے۔ میں اسد کا دوست ہوں۔'' انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

''جی.....'' وہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ خلیل احمد منتظر تھے کہ وہ کچھ بات کرے یا اپنا تعارف کرائے۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر انہیں خود ہی پہل کرنا پڑی۔

''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔''

''سوری ..... میں اجنبیوں سے بلاوجہ کی گفتگو کرنا اچھا نہیں سمجھتی۔'' اس کے کورے جواب پر انہیں شرمندگی ہوئی لیکن ہمت نہ ہاری۔

''لیکن وہ انسان جب آپس میں محوِ گفتگو ہوتے ہیں تو وہ اجنبی نہیں رہتے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

''آپ اجنبیت کی دیوار گرانا چاہتے ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی ہاں۔'' خلیل احمد مسکرائے۔

''وجہ.....؟''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ کافی دیر سے آپ اکیلی یہاں بیٹھی ہیں۔ تو سوچا آپ سے باتیں کر لی جائیں۔''

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہاں تو اور بھی بہت سے لوگ اکیلے بیٹھے ہیں۔ آپ کو ان کا خیال نہیں آیا؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"ان میں سے کوئی "آپ" نہیں ہیں۔" خلیل احمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو لمحہ بھر کو وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، رقیہ ادھر چلی آئی۔

"اوہ..... شکر ہے کہ آپ صاحبہ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ یہ اکیلی بور ہی ہو رہی ہوگی۔" رقیہ ایک خالی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"صاحبہ..... بہت خوبصورت نام ہے۔" خلیل احمد نے سرگوشی کی تو اس نے تیوری چڑھا کے انہیں دیکھا۔

"صاحبہ! یہ خلیل احمد ہیں۔ بھیا کے دوست۔ پاکستان سے آئے ہیں۔" رقیہ نے ان کا تعارف کرایا۔

"پاکستان سے.....؟" وہ پہلی بار بڑے اشتیاق سے بولی۔ "آپ پاکستان سے آئے ہیں۔ پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ بڑے اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔

"آپ نے مکمل تعارف کا موقع ہی نہیں دیا۔" وہ مسکرائے۔

"مجھے پاکستان بہت پسند ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پاکستانی فیملی رہتی تھی۔ بہت ہی اچھے لوگ تھے۔ انہی کی زبانی بہت تعریفیں اور بہت قصے سنے ہیں پاکستان کے متعلق۔" وہ بتا رہی تھی۔

"آپ نے دیکھا ہے پاکستان؟" خلیل احمد دلچسپی سے اس پیاری سی لڑکی کو دیکھنے لگے۔

"نہیں۔ لیکن انشاء اللہ ضرور دیکھوں گی۔" وہ تو ارادہ کیے بیٹھی تھی۔

"چلیں ہم دکھا دیں گے آپ کو پاکستان۔" اس نے پیشکش کی۔

"شکریہ..... میں اگلی بار چھٹیوں میں پاپا کے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے آفر رد کر دی۔ "آپ مجھے پاکستان کے بارے میں بتائیں نا۔ وہاں کا کلچر، وہاں کے لوگ، سب کچھ بتائیں۔" وہ بچوں کی طرح کہہ رہی تھی اور خلیل احمد اسے بتانے لگے۔ وہ نہایت دلچسپی اور توجہ سے سنتی رہی۔

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ خلیل احمد کی لچھے دار باتوں کے جال میں وہ پوری

طرح پھنس چکی تھی۔ تبھی تو ان پر مکمل بھروسہ کر بیٹھی تھی اور چند ہی دنوں میں ان کے قریب آ گئی۔ خلیل احمد نے یہ بات بڑی شدت سے نوٹ کی تھی کہ وہ بے شک انہیں بہت زیادہ چاہتی ہے لیکن اس نے اس چاہت میں کبھی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی، نہ ہی انہیں یہ حد پار کرنے کی اجازت دی تھی۔ جبکہ وہ اس کے قرب کو تڑپ رہے تھے۔ اسے پانے کا ایک بہت ہی سیدھا اور آسان راستہ انہیں سوجھا اور انہوں نے اس سے نکاح کرنے کی اجازت مانگی۔

"کیا..... نکاح.....؟ مگر خلیل! میں نے تو ایسا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ چھپ کر شادی کرنا کیا بہتر ہوگا؟" وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

"ہاں صاحبہ! یہی بہتر ہوگا ..... ورنہ دوسری صورت میں تمہارے والدین کبھی بھی ہماری شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔" خلیل احمد نے کہا۔

"وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں خلیل۔ وہ کبھی ناں نہیں کریں گے۔ میں بات کروں گی ان سے۔" صاحبہ کو اپنے والدین پر مکمل بھروسہ تھا جبکہ خلیل احمد جانتے تھے وہ لوگ نہیں مانیں گے۔ کیونکہ صاحبہ نے انہیں ایک بار بتایا تھا کہ ان کے خاندان میں غیروں کو لڑکیاں نہیں دی جاتی ہیں، نہ ہی غیروں کی لڑکیاں لی جاتی ہیں۔ صاحبہ اپنے والدین سے بات کرنا چاہتی تھی مگر خلیل احمد نے اسے اس حد تک ڈرا دیا کہ وہ چھپ کر نکاح کرنے پر راضی ہو گئی۔

اور پھر ایک دوپہر صاحبہ نے گواہوں کی موجودگی میں اپنا سب کچھ خلیل احمد کے نام کر دیا۔ خلیل احمد، صاحبہ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ یہ پہلا پیار ہی اس کی عمر بھر کی بربادی کا سبب بنے گا۔

خلیل احمد خوش تھے۔ مطمئن تھے کہ انہوں نے صاحبہ کو جیت لیا تھا جبکہ صاحبہ اس عمر میں تھی جس عمر میں لڑکیاں سہانے سپنے پلکوں پر سجاتی ہیں۔ وہ سچ کے نقاب کے پیچھے چھپے جھوٹ کے مکروہ چہرے کو دیکھنے نہیں پاتیں۔ وہ بہت ریزرو لڑکی تھی۔ کسی بھی لڑکے کو لفٹ نہ دیتی تھی مگر تھی تو لڑکی ہی، جو ہمیشہ دھوکا کھا جاتی ہے۔ چاہے کتنی بھی ریزرو ہو۔ کتنی بھی سنبھل سنبھل کے چلے مگر مرد سے ایک مقام پر دھوکا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ضرور کھاتی ہے اپنی لاکھ احتیاط کے باوجود بھی۔ اور وہ دھوکا کھا چکی تھی۔ اس نے ایک مرد پر بھروسہ کیا تھا اور اپنا سب کچھ ان پر وار بیٹھی تھی۔ پھر بھی مطمئن تھی کیونکہ انجام سے بے خبر تھی۔ کیے ہوئے آم کی طرح ان کی جھولی میں آ گری تھی کہ انہوں نے چال ہی کچھ ایسی چلی تھی۔

اور پھر ایک دن وہ واپس چلے گئے۔ اسے نہ بھرنے والا زخم دے کر۔ جانے سے قبل انہوں نے اسے کچھ نہ بتایا تھا۔ بس ایک خاکی رنگ کا بڑا سا لفافہ دے دیا تھا اس تاکید کے ساتھ کے گھر جا کر اسے کھولے۔ اور جب صاحبہ نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں اس کا مستقبل پنہاں تھا..... طلاق نامے کے ساتھ ایک خط بھی ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

''میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو اس قدر حُسن دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے تمہاری طرف بڑھنا چاہا مگر تم بہت ریزرو نکلیں۔ میں ہر حال میں تمہیں پانا چاہتا تھا۔ مصر میں چند دنوں کو یادگار بنانا چاہتا تھا لیکن تم نے کبھی مجھے میری حدیں پار کرنے کا موقع نہ دیا۔ تمہاری حیا ہمیشہ آڑے آتی رہی اور مجھے تم سے نکاح کرنا پڑا کہ تمہیں پانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ اب میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ اپنے گھر۔ جہاں میری بیوی اور ایک سالہ بچی میری منتظر ہیں۔ میں جاتے جاتے ایک نیک کام کیے جا رہا ہوں کہ تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔ تم اپنی ایک نئی زندگی شروع کرو ارسب کچھ بھول جاؤ۔ مہر کی رقم بھی اسی لفافے میں ہے۔ فقط، خلیل احمد۔''

✲

خلیل احمد کی نگاہیں احساسِ ندامت سے جھکی ہوئی تھیں جبکہ صاحبہ ابھی تک چندن کو اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔

''مجھے اتنا بڑا فریب ملا تھا۔ میں جیتے جی مر گئی تھی۔ شریعت کی آڑ میں لوٹا تھا اس شخص نے مجھے۔'' صاحبہ نے خلیل احمد کی طرف اشارہ کیا جن کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

''تم نے میرے ساتھ جو کھیل کھیلا تھا خلیل احمد! اس کا نتیجہ چندن کی شکل میں میرے وجود میں پل رہا تھا۔ میرے ماں باپ کو جب پتہ چلا تو جانتے ہو ان کا کیا ہوا؟ میرے باپ نے زہر کھا لیا تھا اور میری ماں ..... اس نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی جان دے دی تھی۔ ہائے میرے نصیب ..... میرے سر سے چھت چھین لی تھی تم نے خلیل احمد ..... مجھ کو بے اماں کر دیا تھا۔'' صاحبہ نے کرب ناک لہجے میں کہا اور خلیل احمد بس ہونٹ ہی کاٹتے رہ گئے۔

''میرے جینے کا کوئی مقصد نہ رہا۔ مر جانا چاہتی تھی میں۔ تم نے مجھے وہ درد دیا ہے خلیل احمد جس کی کوئی دوا ہی نہیں۔ تم سے کیسے بیان کروں کہ کیا بیتا ہے میرے دل پر ..... میں مر جانا چاہتی تھی لیکن پھر مجھ کو خیال آیا کہ اس ننھی سی جان کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مجھے۔ میں اسے جنم دوں گی۔ تمہیں سونپوں گی اور پھر خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔ میرے پاس تمہارا ایڈریس نہیں تھا۔ بہت مشکلوں سے رقیہ کے ذریعے تمہارا فون نمبر ملا۔ سوچا کہ نہ ہونے سے یہ بھی بہتر ہے۔ پھر جیسے تیسے کر کے میں نے پاکستان آنے کا بندوبست کیا۔ مصر کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا اور پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ میں یہاں بالکل اکیلی تھی۔ بالکل تنہا۔ کسی پر بھروسہ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اللہ کے آسرے پر نکل گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنی دور کا سفر کیا تھا اور وہ بھی تنہا۔ نہ راستے کی خبر، نہ منزل کا پتہ ..... بس چلتی جا رہی تھی۔ لیکن کب تک ..... آخر تھک ہار کے وہیں راستے میں بیٹھ گئی۔ مارے تھکان اور تکلیف کے میری حالت بگڑ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ سنسان، ویران سڑک تھی بالکل میری زندگی کی طرح اور سر پر چلچلاتا، آگ برساتا سورج۔ مجھے شدید چکر آ گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ جب ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے میں پایا اور پہلی نظر ایک ضعیف، شفیق چہرے والی خاتون پر پڑی۔ یہ خالہ تہذیب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

''کیسی ہو اب بیٹی؟'' بڑے ہی میٹھے لہجے میں وہ پوچھ رہی تھیں۔ میں خوف زدہ سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں کہاں ہوں ..... کون ہیں آپ.....؟" میں نے خوف زدہ ہو کر سوال کیے۔

"ڈرو نہیں بچی! آرام سے بیٹھو۔ یہ پانی پیو، بتاتی ہوں میں۔" انہوں نے پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا تھا اور میں نے غٹا غٹ سارا پانی پی لیا تھا جیسے صدیوں کی پیاسی ہوں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح میں بے ہوش ہو گئی تھی اور وہ اتفاقاً اسی راستے سے گزر رہی تھیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ مجھے لے آئیں اپنے ساتھ۔

"تمہیں ایسی حالت میں سفر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کہاں رہتی ہو؟" وہ پوچھ رہی تھیں اور میرے ضبط نے جواب دے دیا۔ میں نے رو رو کے ساری داستان انہیں سنائی۔ وہ سب سنتی رہیں۔ جب میں دل کا بوجھ ہلکا کر چکی تو انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔

"بیٹی! خوشی اور غم، مصائب اور آزمائش تو زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔ ان کے بنا تو زندگی مکمل ہی نہیں ہوتی۔ تمہاری داستان بلاشبہ بہت دکھ بھری ہے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ آزمائشیں صرف انسان ہی کے مقدر میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اسے ان غموں کو صبر سے جھیلنا ہوتا ہے۔ عظیم وہی ہوتا ہے جو دکھوں میں بھی مسکرائے۔ غموں کے بنا خوشی کا تصور نہیں۔ اور یہ ہماری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ جب تک زندگی ہے تب تک ان مصائب کا مقابلہ ہمت سے کرنا ہوگا۔ موت مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ نہ ہی خودکشی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ بلکہ اس طرح تو تمہارے عذابوں میں کبھی کمی ہی نہ آئے گی۔ یہ تو وقتی راستہ ہے ان عارضی دکھوں سے نجات حاصل کرنے کا۔ پھر کیوں خوامخواہ خودکشی کر کے عذاب الٰہی کا مستحق بنا جائے۔"

وہ مجھے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھیں۔ ایک روشنی اتار رہی تھیں میرے اندر۔

"پھر میں کیا کروں؟" میں نے بے بسی سے پوچھا۔

"مقابلہ کرو ان کا ..... شکست دے دو سارے غموں کو۔ تمہیں اس ننھی جان کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کی زندگی امانت ہے تمہارے پاس۔"

"لیکن اگر خدانخواستہ اس آنے والے کی قسمت بھی میرے جیسی ہوئی؟" میں کسی خدشے کے تحت کانپ گئی۔

"قسمت بنانا اور بگاڑنا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے جو کاتب تقدیر ہے۔ جو لوح محفوظ میں اس دنیا میں آنے والے ہر ذی روح کی قسمت محفوظ کر چکا ہے۔ تُو فکر کیوں کرتی ہے بیٹی؟ اس کی ذات پر بھروسہ کرو۔" وہ رسانیت سے بولیں۔

"خلیل احمد کو کہاں ڈھونڈوں گی میں خالہ جی! اتنی بڑی دنیا ہے اور اتا پتہ کچھ معلوم نہیں ہے۔ ان کی امانت ان کے حوالے کرنی ہے مجھ کو۔"

"خلیل احمد کے پاس میں لے جاؤں گی تجھ کو۔" اور تب خالہ نے مجھے بتایا کہ خلیل ان کے رشتہ دار ہیں۔

میں خالہ کے پاس رہنے لگی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے حوصلہ دیتیں۔ ہمت بندھاتیں۔ ان کے وجود سے مجھے ماں کی مہک آتی تھی۔ ان کے نورانی چہرے میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ میری رازدار تھیں۔ میری غم گسار تھیں۔ میری غم آشنا تھیں۔ اپنی حویلی میں نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ مجھے عزت بھی دی۔ بھائی فضل نے مجھے اپنی بہن کہا اور سمجھا بھی۔ دنیا کی نظر میں وہ کاہل اور سست الوجود ہیں مگر میرے لئے ان پڑھے لکھے، خوبصورت لوگوں سے لاکھوں درجے بہتر ہیں جن کے چہروں کے پیچھے ان کے اصلی روپ اتنے گھناؤنے ہیں کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگے۔ میں جتنے دن حویلی میں رہی بہت آرام سے رہی۔ سب ہی لوگ میرا خیال کرتے تھے۔

اس طرح دن سرعت سے آگے بڑھتے گئے۔ اور پھر ایک دن چندن نے جنم لیا اور بیٹی کی پیدائش نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میں ڈر گئی تھی اس کے حسن سے لیکن اس بات کا اطمینان تھا کہ اسے اس کے باپ کی سرپرستی حاصل ہو گی تو یہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رہے گی۔ لیکن مجھ حرماں نصیب کو کیا پتہ تھا کہ قسمت کا اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پھر جب چندن دو ماہ کی ہوئی تو خالہ نے مجھ سے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ خلیل احمد سے ملا جائے۔ ہم نے ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ٹکٹ کنفرم ہو گئی تھیں کہ عین وقت پر بھائی فضل کو ہارٹ اٹیک ہوا اور خالہ کو رکنا پڑا۔ مجھے انہوں نے رکنے کا کہا لیکن میں چاہتی تھی کہ جلد از جلد باپ کی امانت اس تک پہنچا دوں۔ میں نے خالہ سے ایڈریس لکھوا لیا اور اللہ کے آسرے پر کراچی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چلی آئی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میری قسمت کی خرابی مجھ کو یہاں لے آئی ہے۔ میں انسانوں کے اس جنگل میں خلیل احمد کو ڈھنڈ رہی تھی کہ میرا انکراؤ صنوبر سے ہو گیا جو عورت نہیں ڈائن تھی، ناگن تھی ..... میری سادگی اور معصومیت کا فائدہ اٹھا کہ مجھے وہاں لے آئی جہاں گھنگھروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ پر عزتیں ناچتی ہیں۔''

صاحبہ جملہ پورا کر کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ چندن بالکل ہی گنگ تھی جبکہ خلیل احمد کا حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ علی بڑی آہستگی سے اندر آ چکا تھا لیکن سب ہی ماضی کی تلخیوں میں ایسے کھوئے تھے کہ اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

کتنے پل گزر گئے، کتنے لمحے بیت گئے۔ کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آوازیں نہ آ رہی تھیں۔ چندن خالی خالی نظروں سے زمین کو گھورے جا رہی تھی۔ عقیل ہاؤس سے کیسا گہرا رشتہ تھا اس کا۔ اس گھرانے کے ہر فرد سے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ خلیل احمد اس کا سگا باپ تھا جس کی وہ جائز اولاد تھی۔ زیب اس کی سوتیلی بہن تھی۔ خالدہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ علی اس کا تایا زاد تھا لیکن واہ ری قسمت ..... ایک ہی باپ کا خون گردش کر رہا تھا دونوں لڑکیوں میں اور دونوں کی قسمتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک باپ کی اولادیں تھیں وہ اور زیب مگر دونوں کی حیثیت میں کتنا فرق تھا۔ ایک کی پرورش پھولوں کے چمن میں ہو رہی تھی اور دوسری کیچڑ میں پروان چڑھی تھی۔ میری بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ مرد، جو میرا باپ ہے جس نے اپنی ذاتی تسکین کی خاطر ایک معصوم لڑکی کو کانٹوں پر چلنے پر مجبور کر دیا ..... جس نے خواب دکھا کر اپنے ہی ہاتھوں سے ان سپنوں کو چکنا چور کر دیا، جس نے ایک پھول سی لڑکی کے دامن میں انگارے بھر دیے ..... خوشیوں کی تمنا کی تھی اس نے اور اس نے اس کے نصیب میں دکھ ہی دکھ بھر دیے تھے، جس نے ایک ہنستی کھیلتی لڑکی کے لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اسے آہیں اور سسکیاں عطا کی تھیں۔

'اللہ.....' چندن نے اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔

''میں تو وہ گناہ گار شخص ہوں صاحبہ! جو معافی مانگنے کا حق دار بھی نہیں ہے۔''

طویل خاموشی کے بعد خلیل احمد کی آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔ ''لیکن اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' ان کی آواز جیسے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

''معاف کر دینا ..... کتنی آسانی سے کہہ دیا آپ نے ..... ذرا جھانکیں اپنے گریبان میں۔ قابل معافی سمجھتے ہیں خود کو.....؟ قاتل ہیں آپ ..... کسی کی خوشیوں کے قاتل تو کسی کے ارمانوں کے قاتل۔ کسی کے سپنوں کے قاتل تو کسی کی عزت کے قاتل۔ کس منہ سے معافی مانگ رہے ہیں آپ؟ ..... اتنے قتل کیے ہیں آپ نے ..... جواب دیں ..... حساب دیں مجھے ..... میری ماں کو ..... جس کی زندگی برباد کی آپ نے ..... میرے مجرم ہیں آپ ..... ختم کر دیا ہے آپ نے مجھ کو۔'' چندن ان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کے جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے جاری تھا۔ خلیل احمد مجرم بنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا؟ ..... جواب دیں مجھ کو ..... کیوں ہم ماں بیٹی سے جینے کا حق چھینا آپ نے؟ ..... کیوں ہمارے نصیبوں پر سیاہی تھوپی.....؟ مجھے اپنے سائے سے کیوں محروم رکھا.....؟ مجھے اور میری ماں کو تحفظ کیوں نہ دیا.....؟ کیوں کھیلا گیا میری ماں کی زندگی سے .....؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ''باپ تو محافظ ہوتے ہیں۔ مگر آپ تو راہزن نکلے۔'' وہ نڈھال سی زمین پر بیٹھ گئی۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی.....'' خلیل احمد جن کی آنکھوں میں آج تک کسی نے نمی نہ دیکھی تھی وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ ہاتھ باندھے معافی مانگ رہے تھے۔

''کبھی نہیں ..... کبھی نہیں۔'' وہ ان کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی اٹھی اور باہر کی طرف بڑھی ہی تھی کہ سامنے کھڑے علی پر اس کی نظر پڑ گئی اور وہ ذرا دیر کو ہچکچائی مگر پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

علی آگے بڑھا۔ صاحبہ اور خلیل احمد اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ لب بھینچے کھڑا خلیل احمد کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اعتبار اور مان کے رشتے جب ٹوٹتے ہیں تو ان کی کرچیاں روح تک کو زخمی کر دیتی ہیں۔ وہ پل صراط سے گزر رہا تھا۔ اس کے اتنے قابل احترام اور معزز چچا اور شاندار پرسنالٹی والے چچا کا یہ روپ اسے دہلا دینے کو کافی تھا۔ عزت و احترام کا وہ بت جو ان کے لئے اس کے دل میں بنا تھا،

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آج گر کے پاش پاش ہو گیا تھا۔ یہ صدمہ اس کے لئے بھی کم نہ تھا۔ خلیل احمد سر جھکائے کسی مجرم کی طرح صاحبہ کے سامنے کھڑے تھے۔

"جاؤ خلیل احمد! میں نے تمہیں معاف کیا۔ اس لئے کہ اب تمہاری سزا یہی ہو گی کہ تم جب تک زندہ رہو گے، احساسِ جرم تمہیں تڑپاتا رہے گا۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اس لئے کہ میں نے تم سے محبت کی تھی۔ میرے دل میں آج بھی صرف تم ہو۔ ہو سکے تو اپنی بیٹی کو منا لینا۔ اس سے کہنا کہ تمہیں معاف کر دے۔" صاحبہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی اور خلیل احمد لب بھینچے باہر نکل گئے۔

"علی..... تم علی ہو نا.....؟" صاحبہ نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لیکن بڑا یقین تھا اس کے انداز میں۔

"جی....." اس نے اسے دیکھا۔ وقت اور حالات کی گرد میں اس کا حُسن چھپ گیا تھا لیکن نقوش کا تیکھا پن اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ کسی زمانے میں وہ حوروں سے کم نہ ہو گی۔ اس کی صورت چندن سے بہت مل رہی تھی۔

"بیٹھو....." صاحبہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"جیسا چندو نے ذکر کیا تھا تم تو اس سے بھی بڑھ کر ہو۔" صاحبہ نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔

"جی..... چندن نے میرا ذکر کیا تھا۔ کیوں؟" اس کو تعجب ہوا۔

"کوئی جوان لڑکی اپنی ماں سے بطور خاص کسی لڑکے کا ذکر کیوں کرتی ہے؟" صاحبہ شاید اسی کے منہ سے جواب سننا چاہتی تھی۔ وہ چونک گیا۔ کچھ کچھ سمجھ بھی گیا مگر پھر بھی انجان ہی بنا رہا۔

"آپ ہی بتا دیں۔"

"وہ محبت کرتی ہے تم سے بیٹا!" صاحبہ نے واضح الفاظ میں کہا لیکن اسے اس بار تعجب نہ ہوا۔ وہ چپ رہا۔

"میں جانتا تو نہیں تھا لیکن اندازہ ضرور تھا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"اس حرماں نصیب کو پیار کرنے کا حق نہیں ہے بیٹا! ہم جیسے لوگ محبت کرنے

اور کھٹے جانے کے قابل کہاں ہوتے ہیں۔" صاحبہ یاسیت سے بولی۔ "میری بچی کتنی پاگل ہے۔ ریت کے محل بنا رہی ہے..... علی! اس پگلی کو سمجھاؤ کہ گھر کی چہار دیواری کا سکھ اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ تو مٹی میں رُلنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ سکھ کی دنیا بسانے کا خیال چھوڑ دے وہ۔" صاحبہ بولی۔ علی نے سر جھکا لیا۔

"میں نہیں چاہتی کہ کوئی خلیل احمد اس کی زندگی میں بھی آئے اور جھوٹے سپنے دکھا کے اس سے اس کی چند سانسیں بھی چھین لے۔" صاحبہ کرب سے بولی۔

یہ بات علی کے لئے خوشی کا باعث نہ تھی کہ چندن اسے چاہتی ہے۔ اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے حساس دل پر یہ بات بوجھ بن گئی تھی کہ وہ اسے چپکے چپکے چاہتی ہے۔

ہسپتال سے نکلنے کے بعد وہ نجانے کتنی ہی دیر بے مقصد سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ صاحبہ اور چندن کے جملے اس کے دماغ کی دیواروں سے ٹکرا کر بھیانک بازگشت پیدا کر رہے تھے۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا تھا۔

پھر جب رات کی تاریکیوں کا جال ہر سُو پھیل گیا تب اس نے اپنے شل ہوتے جسم کو آرام دینے کے لئے کار کا رخ گھر کی جانب کیا۔ جس وقت وہ عقیل ہاؤس کے پورچ میں اپنی کار کھڑی کر رہا تھا، زیب اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ کار کے رکنے کی آواز سن کر وہ کھڑکی میں آ گئی۔ علی کو تھکے تھکے انداز میں گھر کے اندر جاتے دیکھ کر وہ چونکی۔ اس کی چال، اس کا اتنی دیر سے گھر لوٹنا اس کے لئے باعث تشویش تھا۔

'لیکن میں کیوں فکر مند ہو رہی ہوں؟' اس نے سوچا اور پھر بے نیازی سے سر جھٹکتی ہوئی پلٹ گئی۔

"علی! کہاں تھے یار؟" جلیل احمد کی آواز پر وہ رکا۔

"جی..... وہ بس یونہی ذرا ڈرائیو پر نکل گیا تھا۔" وہ بولا۔

"ہوں..... اچھا ٹھیک ہے..... تم صبح کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"فارغ ہوں۔"

"اچھا تو ایسا کرنا کہ ناشتے کے بعد اسٹڈی میں آ جانا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہیں تم سے۔'' انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ علی اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھکا ہوا جسم بستر پر گراتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا خاص بات ہے جو ابو نے مجھے بلایا ہے۔

*

جلیل احمد اپنی آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور پائپ کو لائٹر کے شعلے سے سلگا رہے تھے۔ علی ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔

''علی! تم کل ہسپتال گئے تھے اور جب سے وہاں سے آئے ہو کچھ پریشان سے دکھتے ہو..... کیا پرابلم ہے؟'' انہوں نے دھوئیں کے مرغولے کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... نہیں تو..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ جلیل احمد نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''برخوردار! ماں باپ سے جھوٹ بولنا بچوں کو زیب نہیں دیتا۔'' وہ مسکرائے تو علی نے سر جھکا لیا۔

''کل میں نے خلیل کو بھی ہسپتال میں دیکھا تھا چندن کے ساتھ۔'' انہوں نے اسے سر سے پکڑا۔ علی نے لب بھینچ لئے۔ اب ان سے کچھ چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔ اسے سب کچھ بتانا پڑا۔ وہ پائپ پیتے ہوئے، دھواں چھوڑنے والے انجن بنے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔

''بس یہ ہے ساری بات۔'' علی نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد انہیں دیکھا۔ ''آپ کو تعجب نہیں ہوا، کچھ غم نہیں ہوا چچا کی اس حرکت پر.....؟'' باپ کے سپاٹ چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ تعجب سے بولا۔

''بیٹا! خالہ جی مجھے پہلے ہی سب باتیں بتا چکی تھیں۔'' چند ثانیے کے توقف کے بعد انہوں نے جواب دیا۔

''کیا..... آپ کو سب معلوم تھا.....؟'' اسے جھٹکا لگا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ خلیل کیا گل کھلا چکا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ لڑکی

کون ہے جس کے ساتھ خلیل نے ایسا کھیل کھیلا۔ نہ ہی صاحبہ کی آپ بیتی کے بارے میں خبر تھی جو آج تمہاری زبانی سن رہا ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ چچا ایسا کام کریں گے۔'' علی بولا۔

''بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات سننے کو ملتے ہیں جن سے ہم اچھی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ رکے۔ علی غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہ صدمہ تمہارے لئے بھی کچھ کم نہ ہوگا۔ جب مجھے علم ہوا تھا تب میری بھی تمہارے جیسی کیفیت تھی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس راز کو اپنے اندر دفن کر دو، جس طرح میں نے اور خالہ جی نے کر رکھا تھا۔''

''لیکن ابو جی!'' علی نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ مگر اب کیا فائدہ۔ بہتر یہی ہے کہ اس راز کو راز ہی رکھا جائے۔ صاحبہ اور چندن کی حقیقت کو منظر عام پر نہ لانے ہی میں سب کی بھلائی اور خیر ہے۔ مجھے ان دونوں سے ہمدردی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نہیں چاہوں گا کہ تم ان کی اصلیت کو اس گھر کے افراد کے سامنے رکھو۔ اگر ایسا ہوا اور تم نے سب کچھ عیاں کر دیا تو نجانے عتیل ہاؤس پر کون کون سی قیامتیں گزر جائیں۔ سب کی بہتری کی خاطر اس راز کو راز ہی رکھنا۔ اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کے بعد شاید کچھ نہ بچے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر زیب کی ہے۔ وہ بہت نازک ہے۔ اگر اس پر باپ کا یہ راز افشا ہوا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ وہ مان، وہ اعتبار ٹوٹ جائے گا جو خلیل پر اسے ہے۔ اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ بڑے ٹھہرے ٹھہرے سے انداز میں رسانیت سے کہہ رہے تھے۔

''اور جو ظلم چچا نے ان دونوں ماں بیٹی پر کیا ہے، اس کا حساب کون لے گا؟'' علی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''حساب لینا، سزا اور جزا دینا اوپر والے کا کام ہے بیٹا! نجانے اس سارے قصے میں اس کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہو۔ لیکن اب تم یہی کرو گے کہ ان سب باتوں کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زبان سے کوئی ایسی بات نکلے کہ عقیل ہاؤس کی بنیادیں ہلا دے۔" اس بار انہوں نے سخت انداز میں کہا۔

"مگر....." علی نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس ..... میں مزید اس ٹاپک پر کچھ سننا نہیں چاہتا۔ تم جاؤ۔ اور ہاں ..... تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم مزید تعلیم کے لئے باہر چلے جاؤ۔ میں انتظام کر رہا ہوں۔ چند ایک دنوں تک سب انتظام مکمل ہو جائے گا۔" انہوں نے اپنی بات پوری کرنے کے بعد میز پر رکھی کتاب اٹھالی اور پڑھنے لگے۔ علی سمجھ گیا کہ وہ مزید کچھ کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"جو کچھ چچا نے کیا اس پر میں بہت شرمسار ہوں۔" اس وقت علی، صاحبہ کے روم میں بیٹھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہاں پہنچا تھا۔

"تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو بیٹا! تمہارا اس میں کیا قصور؟"

"میرا قصور نہ سہی، لیکن ان سے بہت قریب کا رشتہ تو ہے۔ ان کے ہر اچھے برے فعل کا اثر ہم پر ہونا لازمی ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہوتا ہے کہ اگر ہمارے اپنے کوئی اچھا عمل کریں تو ہم فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی برا کام کریں تو وہ ہمارے لئے بھی باعث ندامت ہوتا ہے۔" علی بولا۔

"صحیح کہا تم نے ..... ایک شخص کا اچھا یا برا عمل اس کے پورے خاندان کو متاثر کرتا ہے۔" صاحبہ نے سر ہلاتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ مجھ سے کچھ کام ہے ..... کہو۔"

"آپ کو معلوم ہے نا کہ چندن کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"ہاں ..... ظاہر ہے، ماں ہوں اس کی۔ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے اس کی خواہش، اس کے دل کا حال۔ ہر عورت کا ایک خواب ہوتا ہے۔ اپنا گھر بنانے کا سپنا ہوتا ہے۔ عزت سے جینا چاہتی ہے ہر عورت چار دیواری کا تحفظ چاہتی ہے۔ چندن بھی یہی چاہتی ہے۔ اس نے بھی تمہاری سنگت میں زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن وہ یہ کہتی ہے کہ میں علی کو اپنے ساتھ کیچڑ میں نہیں گھسیٹوں گی۔ میں اس کی عزت کرتی ہوں اور اسے اپنے سائے سے بھی دور رکھوں گی۔" صاحبہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔ علی کو بہت دکھ ہوا۔

"اگر میں آپ سے کہوں کہ میں چندن کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنا چاہتا ہوں تو .....؟" علی کچھ دیر کے توقف کے بعد گویا ہوا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کیا.....؟" وہ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھیں جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ ہو۔

"یہ سچ ہے..... بہت سوچنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ صاحبہ نے بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ جذباتی فیصلہ تو نہیں ہوگا؟..... کیسے یقین کر لوں تمہارا.....؟"

"آپ کو اعتبار کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں کہتا۔" اس نے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط لہجے میں کہا۔

صاحبہ نے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا جہاں کسی دھوکے، کسی جھوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

"مجھے یقین کرنا ہوگا۔ شاید یہ یقین میری بچی کے لئے راونجات بن جائے۔ اللہ! میری بچی کی حفاظت کرنا۔ اس کی مدد کرنا۔" صاحبہ کے دل سے دعا نکلی۔

✲

موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ سیاہ گھنگھور گھٹائیں اپنے آنچل میں سارے آسمان کو سمیٹے ہوئے تھیں۔ سیاہ بادلوں نے سورج کے چہرے پر اپنا نقاب ڈال دیا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے شریر جھونکے بار بار اس کی زلفوں سے ٹکراتے اور وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے انہیں بار بار ہٹاتی۔ موسم بے حد حسین تھا لیکن اس کا دل اداس تھا۔ کہتے ہیں جب دل کا موسم اچھا نہ ہو، غموں کے بادل، دل کے آسمان پر چھائے ہوں اور دکھوں کی ہوا چل رہی ہو تو باہر کا موسم چاہے کتنا ہی حسین ہو، دل کو نہیں بھاتا۔ ہمارے گرد و پیش میں چاہے کتنی ہی خوب صورتیاں بکھری ہوں، موسم چاہے کیسے کیسے جلوے دکھا رہا ہو، سب دُھندلا جاتا ہے۔ سارا حُسن گرہن زدہ لگتا ہے۔ ہر رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا دل اداس ہوتا ہے اور ہر موسم کا تعلق دل سے ضرور ہوتا ہے۔ عجب ہوتا ہے گوشت پوست کا یہ لوتھڑا۔ جب خوش ہوتا ہے تو سارا عالم گنگنانے لگتا ہے۔ جب اداس ہوتا ہے تو ہر شے پر کہری چھا جاتی ہے۔

وہ کسیے انجوائے کرتی اس موسم کو کہ اس کے اندر تو ایک ہی موسم پہرہ جمائے ہوئے تھا۔ موسم خزاں..... وہ اپنے کمرے میں تنہا کھڑکی سے باہر سمندر کی آتی جاتی

لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے ساتھ ساتھ کب اس کی آنکھیں بھی برس اٹھی تھیں اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ اس قدر گمبھیر خاموشی میں صرف سمندر کی لہروں کا شور تھا جس میں ایک عجیب سی موسیقیت پنہاں تھی۔ مچلتی، ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی لہریں۔ پانی کی بے کراں موجیں..... وہ اپنے ہی دکھوں میں الجھی تھی۔ اس قدر کہ علی کی آمد کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

"چندن!" اس نے قریب آ کر اسے پکارا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر یونہی کھڑی رہی۔ "چندن! میری طرف دیکھو گی بھی نہیں؟" اس نے دوبارہ پکارا تو وہ پلٹی۔

"آپ..... کیوں آئے یہاں؟ کیسے؟" وہ اسے دیکھ کر بے حد حیران تھی اور حیرت سے زیادہ اسے پریشانی ہو رہی تھی۔

"گھر آئے مہمان سے ایسا سلوک کرتی ہیں آپ؟" وہ مسکرایا تو وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے۔ میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"لیکن مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" بلا ارادہ ہی اس کے منہ سے "تم" نکل گیا۔ چندن کو بہت اچھا لگا۔ کیسا اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔

"میرا، آپ کا ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ مجھ کو آپ، تم کہہ کر مخاطب کریں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ حالانکہ جی کہہ رہا تھا کہ وہ اس سے کہے کہ تم ہمیشہ مجھ کو اسی طرح پکارا کرو۔ اس طرح تمہاری اپنائیت اور پسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے۔

"رشتہ بنایا تو جا سکتا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"میں تم کو اپنانا چاہتا ہوں۔" بہت ہی سادہ سے الفاظ میں اس نے گویا پیغام دے دیا تھا۔

"کیا.....؟" چندن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ اندازہ ہے کیا فرمایا ہے آپ نے؟" وہ جز بز ہوتی ہوئی بولی۔

"بہت اچھی طرح سے....." وہ اطمینان سے بولا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مجھے اس قسم کا مذاق قطعی پسند نہیں ہے۔"

"یہ مذاق تو نہیں ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"چلے جائیں..... چلے جائیں یہاں سے پلیز۔ میں اور کوئی بات نہیں سنوں گی۔ سمجھے آپ؟" وہ چیخی۔

"نہیں..... ایسے نہیں جاؤں گا۔ پہلے تمہیں ہاں کہنا ہوگی۔"

"مذاق سمجھ رکھا ہے کیا آپ نے؟..... شادی کریں گے، اپنائیں گے مجھ کو..... سب جانتے ہیں، پھر بھی..... پاگل ہو گئے ہیں..... یا اپنے چچا کی طرح کوئی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں..... بولیں، جواب دیں؟" اچانک ہی اس نے علی کا گریبان پکڑ لیا۔علی اس کی اس حرکت پر بوکھلا گیا۔

"میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں، سمجھیں۔ تمہیں اس دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"مذاق کرنے کو میں ہی ملی تھی کیا؟" وہ پھر چلائی۔

"یہ مذاق نہیں ہے، سچ ہے۔ دیکھو میری آنکھوں میں، کیا یہ جھوٹ کہہ رہی ہیں؟" علی نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں..... نہیں..... میں تمہاری آنکھوں میں نہیں جھانک سکتی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ سچ ہے۔ مگر میں تمہیں کیسے بتاؤں، کیسے کہوں کہ میں تمہاری زندگی میں نہیں آ سکتی۔ میں تم کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

وہ بے اختیار اس کے کشادہ سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔علی نے دروازے میں کھڑی گلاب کو دیکھا جو حیران پریشان یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے اسے پانی لانے کو کہا اور چندن کو خود سے الگ کرتے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا۔ گلاب فوراً پانی لے آئی تھی۔ گلاس اس کے ہاتھوں سے لینے کے بعد علی نے اسے جانے کو کہا۔ وہ چلی گئی تو علی نے گلاس چندن کی طرف بڑھایا۔

"لو..... پی لو۔"

چندن نے بمشکل دو گھونٹ لئے اور گلاس رکھ دیا۔ آج تو آنسوؤں کا سیلاب کسی طرح رک ہی نہ پا رہا تھا۔ نہ جانے کب کا غبار جمع تھا اس کے اندر۔ وہ زہر، وہ

کرب، وہ درد، وہ حسرتیں جو نہ جانے کب سے اس کے اندر جمع تھیں آج "اس" کے سینے سے لگ کے سب بہہ نکلیں۔

علی خاموش تھا۔ اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے روتے ہوؤں کو چپ کرانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے چپ کرائے جو شاید آج اپنے آنسوؤں میں دنیا کو ڈبونے کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔

"پلیز..... چپ ہو جاؤ۔ دیکھو، مجھے روتوں کو چپ کرانا نہیں آتا۔" وہ آخر کار جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سادگی سے بولا۔

"کمال ہے..... دوسروں کو رُلانے والے کو آنسو پونچھنا نہیں آتے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ آنسوؤں اور مسکراہٹ کا کتنا حسین سنگم تھا۔ سیاہ لباس میں اس کا پُر سوز حُسن غضب ڈھا رہا تھا۔ وہ جواب تک محض ہمدردی میں بلکہ شاید بوکھلاہٹ میں اس کے بہت نزدیک بیٹھا تھا، اس کے نازل ہوتے ہی پیچھے کو کھسک گیا۔

"میں جانتے بوجھتے کسی کے آنسوؤں کا سبب نہیں بنا تھا۔ سب کچھ لاعلمی میں ہوا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"ہاں..... جن کے مقدر میں ہی آنسو لکھ دیئے گئے ہوں۔ اس میں آپ کا کیا قصور؟" وہ افسردگی سے اس کے رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی اور پانی کا گلاس اٹھا کر ایک بار پھر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

"پیاس لگی ہے تو اور منگواؤں پانی؟" اس نے پوچھا۔

"برسوں کی پیاس ہے..... پانی سے کب بجھے گی؟" وہ تلخی سے بولا۔ "علی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی کی ہے مگر پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کوئی آپ پر انگلی اٹھائے۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے دھیرے سے بولی۔علی چند لمحے تک اسے یونہی دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"کتنا چاہتی ہو مجھ کو.....؟" اس کے سوال پر چندن نے اسے دیکھا۔ "تمہاری ممی نے مجھ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے کہا تو چندن نے گہری سانس لی اور نگاہیں جھکا لیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اندازہ ہو گیا تھا مجھے۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "علی! میں بہت چاہتی ہوں آپ کو۔ اور جتنا چاہتی ہوں اس سے کہیں زیادہ عزت کرتی ہوں۔ اور جس کو چاہا جائے، جس کی عزت کی جائے اس کی تکریم اور بہتری کی خاطر جان سے گزرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ میری پرچھائیں سے بھی دور رہیں آپ کہ میں نہیں چاہتی میرے نصیب کی سیاہی آپ کے دامن پر لگے۔ کیونکہ اس طرح صرف آپ ہی نہیں، عقیل ہاؤس کے سارے افراد متاثر ہوں گے۔ وہ سب بہت اچھے ہیں۔ میں نہیں چاہتی، میری وجہ سے آپ سب کو کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ پلیز ..... منت کرتی ہوں میں آپ کی۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔

"میری بات پر بھروسہ کرو گی؟" علی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ایمان لاتی ہوں آپ کی ہر بات پر۔" وہ جذبے سے چور چور لہجے میں بولی۔

"تو پھر انکار مت کرو۔" وہ بہت آہستگی سے بولا۔ چندن چپ سی ہو گئی۔ بالکل یوں جیسے پوری کائنات نے سانس لینا بند کر دیا ہو۔ ہر شے ساکت و جامد ہو گئی۔ کتنے پل، کتنی ساعتیں اسی خاموشی کی نذر ہو گئیں۔

"میری سانسیں رک جائیں گی علی ..... میری نبض تھم جائے گی....." اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

"میرا فیصلہ لمحوں کا نتیجہ نہیں ہے چندن! ..... نہ ہی جذباتی سوچ کا نتیجہ ہے۔ سوچ سے عمل تک کا یہ فاصلہ صدیوں پر محیط تھا۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ اور اتنا یقین کر لو کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو فیصلہ کر کے پچھتاتے نہیں ہیں۔" وہ مضبوط اور پختہ لہجے میں بولا۔

"لیکن آپ کے گھر والے ..... یہ دنیا ..... یہ معاشرہ ..... کیسے قبول کرے گا مجھے..... آپ کے اس فیصلے کو.....؟" وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی۔

"مرد اگر ایک بار دل سے کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونے سے نہیں ہچکچاتا اور نہ ہی اسے کسی کا ڈر ہوتا ہے۔ میں نے جو فیصلہ کر لیا سو کر لیا۔ تم اطمینان رکھو..... جب مجھے کسی کی پرواہ نہیں تو تم کیوں کرتی ہو؟ اور ویسے بھی اچھا یا برا انسان کو حالات بناتے ہیں۔ کوئی بھی ذی روح جب اس دنیا

میں آتا ہے تو بالکل معصوم ہوتا ہے۔ جو ہوا اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔" وہ رسانیت سے بولا۔

"علی! آپ فرشتہ ہیں، انسان نہیں۔ کیسے شکریہ ادا کروں آپ کا؟"

"بیٹھو یہاں اور میری کچھ باتیں سن لو۔" علی سنجیدگی سے بولا۔ چندن نے اپنے آنسو صاف کئے اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہمارا نکاح اسی ہفتے کے اندر اندر ہو جائے گا۔ کیونکہ مجھے اسپیشلائزیشن کے لئے باہر جانا ہو گا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

"کتنے عرصے کے لئے؟" چندن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"دو سال کے لئے۔"

"دو سال یا دو صدیاں....." اس نے طویل سانس لی۔

"ہم اس نکاح کو فی الحال راز ہی میں رکھیں گے۔ میں صرف خالہ کو بتاؤں گا۔ کیونکہ انہیں اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ پھر میں خود ہی اپنے گھر والوں کو بتا دوں گا اور انہیں منانے میں خالہ کی بھی مدد مجھے درکار ہو گی۔ اور تیسری بات میں تمہیں نکاح کے بعد بتاؤں گا۔" علی نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ سب انتظام کر کے ہی آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

علی چلا گیا اور چندن کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ہے۔ وہ ابھی تک علی کے جملوں کے سحر میں قید تھی۔

✲

اس وقت چندن کے فلیٹ میں چند حضرات مع قاضی صاحب کے موجود تھے۔ علی سفید رنگ کا کلف دار شلوار سوٹ اور میرون کلر کی واسکٹ پہنے بیٹھا اشعر سے باتیں کر رہا تھا۔ اشعر کے علاوہ علی کے چند قریبی دوست بھی وہاں موجود تھے۔ علی نے انہیں چندن کی حقیقت نہیں بتائی تھی، صرف اتنا کہا تھا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ صرف اشعر ہی چندن کی حقیقت سے واقف تھا۔ نکاح پڑھانے کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔

چندن اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔ اس کے پاس اشعر کی بیوی اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گلاب موجود تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کھوئی ہوئی تھی کہ گلاب نے اسے قاضی صاحب کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ چونکی۔ اشعر کی بیوی نائمہ نے اسے دوپٹہ اوڑھا دیا اور پھر گلاب سے کہا کہ وہ قاضی صاحب کو بلا لے۔ قاضی صاحب سمیت اشعر بھی وہاں موجود تھا۔

''بھابی! علی نے کہا ہے کہ حق مہر آپ اپنی مرضی کا لکھوا دیں۔'' اشعر بہت ادب سے اس سے مخاطب تھا۔

'بھابی!' چندن نے نگاہ تشکر اس پر ڈالی۔ 'شکریہ اے محترم انسان، تو نے مجھے بھابی کہہ کر عزت دی ہے۔ کیسا ترسی تھی میں ایسی عزت پانے کو..... میرے اللہ نے میری سن لی۔ مجھے سرخرو کر دیا۔' چندن کو اس وقت اشعر نہایت ہی قابل عزت لگا تھا۔

''شرعی مہر ہو گا۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور اشعر سمیت نائمہ نے بھی قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

قاضی صاحب نکاح پڑھا چکے تھے۔ اشعر اسے مبارک باد دے کر جا چکا تھا اور نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئی تھی۔ نائمہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اسے موقع پر لڑکی روتی ہے۔ مگر جب جیون ساتھی کا پیار ملتا ہے تو وہ اپنی قسمت پر نازاں ہوتی ہے۔''

جبکہ وہ سوچ رہی تھی کہ کیسی شادی ہے میری۔ نہ مہندی لگی، نہ بارات آئی، نہ بینڈ باجے بجے، نہ ڈھولک کی تھاپ، نہ عروسی جوڑا، نہ ہی ماں باپ کی دعاؤں کی مقدس چھاؤں ملی ..... ساری عمر ایسی ہی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترسی ہوں ..... لیکن میں شاکر ہوں اپنی قسمت پر کہ علی جیسے شوہر کا ساتھ ملا ہے جس نے مجھے چہار دیواری کا تحفظ دیا ہے۔

کچھ دیر بعد سب لوگ چلے گئے۔ صرف اشعر رہ گیا تھا۔

''اشعر! تم نائمہ بھابی کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد اپنی کار میں آ جاؤں گا۔'' اور اس کی بات پر اشعر نے متعجب ہو کر اسے دیکھا مگر بنا کچھ کہے اٹھ

کھڑا ہوا۔ علی بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئے جہاں نائمہ، چندن سے محو گفتگو تھی۔ اسے دیکھ کر چندن سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''اچھا بھابی! اب ہمیں بھی اجازت دیں۔ آپ بھی تھک گئی ہوں گی، آرام کیجئے۔ چلو نائمہ!'' وہ دونوں میاں بیوی اجازت لے کر چلے گئے تو علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر آ گیا۔

چندن کا دل آج ایک عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ علی نے ایک نظر اس کے گلاب جیسے کھلتے چہرے پر ڈالی اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''چندن! خوش ہو؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو ذریعہ اظہار بن سکیں۔ اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ قدرت نے مجھے اتنی بڑی خوشی سے نوازا ہے کہ لگتا ہے جیسے میری جھولی میں کائنات سمٹ آئی ہے۔ میں خوشیوں سے نا آشنا تھی۔ مجھے آپ نے اس نعمت سے آشنا کرایا ہے۔ کبھی تو لگتا ہے جیسے یہ سب خواب ہے۔ میری آنکھیں کھلیں تو کہیں یہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔ آج اس مُردہ جسم میں روح پھونک دی ہے آپ نے۔ وہ مان دیا ہے کہ پیر زمین پر نہیں ٹک رہے۔ میری ذات کو یقین کی دولت دی ہے۔ اپنے برابر لا کر مجھے میری نظروں میں محترم کیا ہے۔ میں وسوسوں میں گھری تھی۔ سوچتی تھی کہ کیا کبھی میرے سپنے بھی سچ ہوں گے۔ لیکن آج میرے سپنوں کو حقیقت کا روپ دیا ہے آپ نے۔ بس نہیں چل رہا کہ دنیا و کائنات، زمین اور آسمان میں چراغاں کروں، موتیوں کی بارش کر دوں، خوب ہنسوں، خوب قہقہے لگاؤں۔''

وہ سرشاری کے عالم میں کہہ رہی تھی اور علی اس کے چہرے پر بکھرے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ چہرے پر انوکھی چمک تھی۔

''چندن! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا، تیسری بات کہنے کا۔'' علی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

''ہاں ..... میرے کان منتظر ہیں۔'' علی اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا آیا اور باہر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جھانکا جہاں تاریکی کا جال پھیلا تھا اور اس تاریکی میں مہیب سمندر ایک بڑے سے سیاہ دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"میں یہ کہنا چاہتا تھا چندن! کہ جب تک میں سب کے سامنے تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے پیش نہ کر دوں، تب تک میں تم پر اپنا حق استعمال نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟" وہ ٹھہرے ٹھہرے سے انداز میں بولا۔ چندن بچی نہ تھی کہ اس کی بات نہ سمجھ سکتی۔ وہ ساکت پلکوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عظمت کے اتنے اونچے منبر پر بھی کوئی بیٹھ سکتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ تمہارے قدموں کی دھول بھی نہیں ہوں میں ..... چندن اٹھی اور مارے عقیدت کے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"میرے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ آپ نے مجھ کو اپنا نام دیا ہے۔ آپ کا ہر اقدام، گزرتا ہوا ہر ہر لمحہ میرے دل میں آپ کی محبت، آپ کا احترام بڑھاتے ہی گئے ہیں علی! لیکن میں آپ سے صرف ایک چیز اور مانگنا چاہوں گی....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو!" علی نے محبت سے کہا۔

"مجھے مکمل عورت بنا دیں، میرا ادھورا پن دور کر دیں ..... میں صرف اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہوں، آپ کا عکس اپنی بانہوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ التجائیہ انداز میں بولی اور علی کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

"لیکن چندن! میں پہلے تمہیں تمہارا گمشدہ مقام دلانا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"وہ بھی مل جائے گا۔ لیکن بالفرض اگر ایسا نہ ہو سکا تو تب میرے پاس جینے کا بہانہ تو ہو گا نا۔" وہ بولی اور علی نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"تمہیں کچھ دن انتظار کرنا ہو گا چندن!" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے منظور ہے ..... آپ ناراض تو نہیں ہیں؟" نہ جانے کس خدشے کے تحت اس نے پوچھا۔

"کیوں بھلا؟..... تمہارا جو حق ہے، تمہیں ضرور ملے گا۔" اس نے مسکرا کر آہستگی سے اپنے ہاتھ دو ملائم زنجیروں سے آزاد کئے۔

"ایک سوال پوچھوں؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ضرور پوچھو۔"

"آپ نے نکاح صرف ہمدردی کی بناء پر کیا ہے یا پھر میرے لئے کوئی خاص جگہ تھی آپ کے دل میں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ خیال کیونکر آیا تمہارے ذہن میں؟" وہ چونکا۔

"اس لئے پوچھ بیٹھی ہوں کہ محض ہمدردی کی بناء پر تو آپ نے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا دی۔ کہیں آپ کے دل میں پہلے ہی سے کسی لڑکی کی تصویر موجود ہو اور میری خاطر قربانی دے دی ہو۔"

علی مسکرا دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے ..... یہ خدشے، یہ واہمے بے بنیاد ہیں۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کے متعلق کبھی ایسا نہیں سوچا۔ اتنا وقت ہی نہ تھا کہ محبت کے فلسفے پر غور کرتا۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میری زندگی میں آنے والی تم پہلی لڑکی ہو۔ نکاح سے پہلے بھی میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا لیکن اب جبکہ تم میری زندگی میں شامل ہو چکی ہو تو شاید آہستہ آہستہ میرے دل کے ہرخانے میں فٹ ہو جاؤ، باقی یہ سب قربانی وغیرہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ مجھ جیسا معمولی بندہ بھلا کیا قربانی دے گا۔" وہ انتہائی صاف گوئی سے بولا۔ اور چندن نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو گویا میں وہ پہلی خوش قسمت لڑکی ہوں جس نے آپ کے دل کے زنگ آلود تالے کو توڑ کر آپ کا دل آباد کیا ہے۔" وہ عالم فخر سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے واپس صوفے پر آ بیٹھا۔

"ایک اور بات کہنی تھی۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "زندگی میں ہم انسان پلاننگ تو کرتے ہیں اپنے مستقبل کی، اپنی زندگی کی۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ کبھی کبھی تقدیر میں کچھ اور لکھا ہوتا ہے جو ہم انسانوں کی پلاننگ کو فیل کر دیتا ہے۔ میں تمہارے حق میں بالکل مخلص ہوں۔ لیکن تقدیر کب اور کس وقت کیا موڑ لے، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ اگر کبھی کوئی آزمائشی لمحہ آیا جب میں بہت زیادہ مجبور ہو جاؤں تو کیا تم میرا ساتھ دو گی؟" وہ گمبھیرتا سے بولا۔ "میرے والدین اس دنیا میں ہر شے سے زیادہ محترم ہیں میرے لئے ..... میں ان کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کر سکتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اگر کبھی کوئی ایسا لمحہ آیا تو کہیں تم مجھے غلط تو نہیں سمجھنے لگو گی؟'' علی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آپ پر مجھے خود سے بڑھ کر بھروسا ہے۔ آپ پر شک کر کے مجھے گناہ گار نہیں بننا۔ آپ سے منسلک ہر شے میرے لئے محترم ہے۔ اگر کبھی آزمائش کا کوئی لمحہ آ۔ پہنچا تو مجھے پیچھے ہٹتا ہوا نہ پائیں گے آپ۔'' وہ بہت سچائی سے بولی۔

''تھینک یو چندن! تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔'' اس نے چندن کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب میں چلوں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کب آئیں گے پھر؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''جلد ہی۔'' علی مسکرا دیا اور لوٹ آیا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ ایک بھاری بوجھ اس کے دل سے اتر چکا تھا۔ وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ چندن کو اس کا حق دلانے کے لئے وہ پہلا قدم اٹھا چکا تھا۔ وہ اس کی راہ کے کانٹے چننا چاہتا تھا اور اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس عمل سے اس کے اپنے ہاتھ لہولہان ہو جائیں گے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہ تھا۔ وہ ایک ثابت قدم اور خلوص ارادہ رکھنے والا مرد تھا۔ اب اسے اس نکاح کے متعلق اپنے والدین کو بتانا تھا۔ اسے اس کی کچھ پرواہ نہ تھی کہ کوئی اس کے اس عمل سے خوش ہوتا ہے یا ناراض۔ اسے سب سے زیادہ پرواہ اپنے والدین کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ بہت خفا ہوں گے۔ بہت بگڑیں گے۔ مگر اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ انہیں راضی کر لے گا۔ کیونکہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ بیٹا جس کی کوئی بات انہوں نے آج تک نہ ٹالی تھی۔

وہ اسی اطمینان کو لئے جب بستر پر لیٹا تو نیند سے بوجھل آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔

✲

قدرت کبھی انسان کو مکمل خوشی نہیں دیتی ہے۔ اگر ایک طرف سے اسے خوشیاں، بہار کے روپ میں ملتی ہیں تو دوسری جانب سے غموں کا کوئی گرم جھونکا ان بہاروں کو خاکستر کر ڈالتا ہے۔ علی سے نکاح اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی مگر صاحبہ

کی موت اس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا!

اگلے دن جب وہ اسے اپنے نکاح کی خوشخبری سنانے گئی تھی تو تب وہ کتنی خوش تھی۔ زندگی میں پہلی بار چندن نے اس کے چہرے پر خوشی اور سکون کی لہر دوڑتی ہوئی دیکھی تھی اور یہی خوشی اس کی زندگی کی آخری خوشی ثابت ہوئی۔ موت نے اسے مزید مہلت نہ دی اور وہ اپنے آخری امتحان سے بھی چھٹکارا پاتی ہوئی موت کی وادیوں میں کھو گئی۔ ساری زندگی وہ دکھوں کی آگ میں جلتی رہی تھی۔ سلگتی رہی تھی۔ لیکن آخری وقت میں وہ بہت پُرسکون ہو گئی تھی۔ آج اس کا آپریشن ہونا تھا لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔

خلیل احمد جو اس سے ملنے آئے تھے اس کی موت کی خبر سن کر دھک سے رہ گئے تھے۔ انہوں نے روتی بلکتی چندن کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''کیوں آ گئے آپ؟ اب کیا بچا ہے، سب ختم ہو گیا ہے۔ چلے جائیں..... چلے جائیں۔ میری ماں نہیں رہی ہے اب۔'' انہیں دیکھتے ہی وہ چلائی۔

''مجھے معاف کر دو بیٹی..... مجھے معاف کر دو۔'' وہ اشک بار نگاہوں سے صاحبہ کے مُردہ جسم کو دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''معاف کر دوں.....؟ میری ماں کے قاتل ہیں آپ۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ جلیل احمد اور خلیل احمد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نگاہیں چرا لیں۔ پھر جلیل احمد آگے بڑھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! معاف کر دو اس بدقسمت انسان کو۔ ورنہ یہ موت کے بعد بھی بے چین ہی رہے گا۔''

''میری ماں بھی تو بہت بے چین رہی تھی۔ کسی کو ان کی تڑپ کا اندازہ ہے؟'' اس نے صاحبہ کے مُردہ، بے جان ہاتھ کو چومتے ہوئے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''مجھے احساس ہے بیٹی! مگر میں پھر بھی تم سے یہی گزارش کروں گا کہ معاف کر دو مجھے۔''

''کبھی نہیں..... کبھی نہیں۔'' چندن نے نفرت سے کہا اور جلیل احمد ہارے ہوئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جواری کی طرح باہر نکل گئے۔

تجہیز و تدفین کی ذمہ داری کو علی نے پورا کیا۔

جب وہ فارغ ہو کے گھر آیا تو چندن رو رہی تھی۔

"بس کرو چندن ..... اس طرح رونے سے ان کی روح کو تکلیف ہو رہی ہو گی۔" علی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"علی! میری ماں ..... میری بدنصیب ماں....." وہ اس سے لپٹ کر زار و قطار رو رہی تھی۔

"ہر انسان پر یہ وقت آتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں موجود ہر شے فانی ہے۔ مٹ جانے والی ہے۔ یہاں کوئی ہمیشہ کے لئے نہیں آتا۔ ہر ایک کو مقررہ دن، مقررہ وقت پر جانا ہی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی کو پہلے جانا ہوتا ہے اور کوئی بعد میں جاتا ہے۔ یہ تو رسم دنیا ہے۔" وہ اس کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تنہا کر گئی ہیں وہ..... لیکن آپ مجھے نہیں چھوڑیں گے اکیلا۔ ورنہ میں جی نہ سکوں گی۔" وہ نہ جانے کن واہموں میں گھر گئی تھی۔

"پگلی ہو ..... خدا اور رسولؐ کو گواہ بنا کے اپنایا ہے تمہیں۔ کوئی مذاق نہیں کیا ہے۔" وہ پیار سے بولا۔ "چلو اٹھو اور منہ ہاتھ دھو کے آؤ، شاباش۔" علی نے زبردستی اسے واش روم کی طرف بھیجا اور خود دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

✲

عقیل ہاؤس کے ہر فرد کو صاحبہ کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ سب سے زیادہ دکھ خالہ تہذیب کو ہوا تھا۔ وہ تو خبر ملتے ہی فوراً چندن کے فلیٹ پر چلی گئیں جبکہ باقی افراد خانہ نے مل کر جانے کا پروگرام بنایا۔ سبھی ساتھ جانا چاہ رہے تھے لیکن دادی نے سب کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا کہ اتنا رش دیکھ کر وہ بچی کہیں گھبرا ہی نہ جائے۔ لہٰذا صرف گھر کی بزرگ خواتین اور لڑکیوں میں عرشیہ اور زیب کو جانے کی اجازت ملی کہ وہ دونوں بڑی تھیں۔

اس وقت سبھی لوگ چندن کے فلیٹ میں تھے۔

چندن نے پشاور والی کوٹھی بیچ دی تھی اور سب ملازموں کو بھی چھٹی دے کر مستقل رہائش گاہ اسی فلیٹ کو بنا لیا تھا۔ صرف گلاب اس کے ساتھ تھی جو اپنی مرضی اور خوشی سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔

چندن کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم اس وقت مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اظہار تعزیت کر رہے تھے جبکہ خالہ کے تو آنسو ہی نہ تھم رہے تھے۔ صاحبہ انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھی۔ اس وقت ان کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ خلیل احمد کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ بتا اے شقی القلب انسان! تجھے کیا مل گیا کسی کی زندگی میں اندھیرا کر کے؟ لیکن وہ چپ رہنے پر مجبور تھی۔

دوسری طرف زیب اور خالدہ کو دیکھ کر چندن کا دل رو رہا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے، ہم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں مگر ہماری قسمتیں کیسی جدا جدا ہیں۔ تم نے پھولوں کی سیج پر پرورش پائی اور میرا وقت کانٹوں پر گزرا۔ تم نے ساری عمر راحتیں پائیں، مسرتیں اور محبتیں حاصل کیں اور میرے نصیب میں صرف بے سکونی آئی ..... صرف ذلتیں آئیں ..... صرف غم اور نفرتیں آئیں..... تم کو عزت کی زندگی ملی اور میں در بدر بھٹکتی رہی۔ تمہارے سر پر باپ کی شفیق چھاؤں تھی اور میں دھوپ میں جلتی رہی۔ لیکن پھر بھی تمہارے حق میں دعا گو ہوں اے میری بہن! کہ تمہارا اس میں کیا دوش ہے ..... اور یہ عورت جو میری سوتیلی ماں ہے، کیا ہوا جو سوتیلی ماں ہے..... لیکن اس کی اور میری ماں کی قسمت میں کتنا فرق ہے۔ میری ماں جو کبھی انہی کی طرح ایک معزز اور عزت دار گھرانے کی لڑکی تھی، اسے میرے باپ نے پامال میں دھکیل دیا۔ لیکن یہ عورت جو پورے عزت و احترام کے ساتھ ڈولی میں بٹھا کے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اس کے گھرانے کی بہو بنا کے لائی گئی تھی، اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا گیا۔ اسے تخت نصیب ہوا اور میری ماں کے مقدر میں بھٹکنا لکھ دیا گیا۔ کتنا فرق ہے ان ماں بیٹی کی قسمت میں اور ہم دونوں کی قسمت میں۔ ہم دونوں نے ایک شخص کی خود غرضی کی سزا پائی۔ نہ جانے کس گناہ کی سزا ملی ہے ہم کو..... اور نہ جانے کون سا ثواب ملا ہے ان کو کسی نیکی کا جو سارا جہاں ان کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

قدموں میں ہے۔

❁

شام ہی سے خلیل احمد کی طبیعت ناساز تھی، لیکن رات کو تو اور بھی بگڑ گئی تھی۔ خالدہ نے گھبرا کر جلیل احمد کو جگایا۔ اتنی رات گئے انہیں دیکھ کر وہ فکرمند ہو گئے۔

"ان کی طبیعت بہت خراب ہے بھائی صاحب! نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"روئیں مت..... میں دیکھتا ہوں۔" وہ جلدی سے خلیل احمد کے کمرے میں گئے۔ تائی امی بھی فکرمند سی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ جلیل احمد، بھائی کا چیک اپ کرنے میں مصروف تھے۔ خالدہ مسلسل رو رہی تھیں اور تائی امی انہیں حوصلہ دے رہی تھیں۔

"کب سے ہوئی ہے ان کی یہ حالت؟" وہ مکمل چیک اپ کرنے کے بعد پوچھ رہے تھے۔

"شام سے ہی کہہ رہے تھے کہ دائیں ہاتھ اور پیر میں درد ہے۔ میں نے ٹیبلٹ وغیرہ دی تھی کہ شاید کچھ افاقہ ہو جائے۔ مگر یہ تو ٹھیک ہونے کی بجائے مزید تکلیف کا شکار ہو گئے۔ اب ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔" خالدہ بتا رہی تھیں۔

"ہوں..... رقیہ! تم علی کو جگا کے لاؤ فوراً۔" انہوں نے بیوی سے کہا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ "انہیں ہسپتال لے جانا ہوگا۔" جلیل احمد بولے۔

"ہسپتال..... یا اللہ خیر۔ کیا طبیعت زیادہ خراب ہے؟" انہوں نے دل تھام لیا۔

"ہوں....." جلیل احمد نے سر ہلا دیا۔

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں، کسی کو ضرورت نہیں ہے ساتھ جانے کی۔ علی کافی ہے۔" انہوں نے سختی سے کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔ اتنے میں علی بھی سلیپنگ گاؤن پہنے وہاں آ موجود ہوا۔

"خیریت ہے ابو.....؟" وہ ایک نظر چچا پر ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہوں..... تم فوراً کپڑے چینج کر کے آؤ۔ ہسپتال جانا ہے۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہا اور علی تیزی سے باہر نکل گیا..... بات یقیناً سیریس ہو گی۔ تبھی ابو اتنے

پریشان ہیں..... وہ سوچ رہا تھا۔ جھٹ پٹ اس نے کپڑے بدلے اور نیچے آ گیا۔ جلیل احمد بھی اپنے کپڑے بدل چکے تھے۔ ان دونوں نے سہارا دے کر خلیل احمد کو اٹھایا، کیونکہ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے اور کار تک لائے۔ خالدہ اور تائی امی بھی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ انہوں نے خلیل احمد کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے جبکہ علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"سنو! کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ دونوں بھی سونے کی کوشش کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے دونوں خواتین کو حوصلہ دیا اور پھر کار تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

"آخر چچا کو ہوا کیا ہے؟" کار کو کھلے روڈ پر نکالتے ہی اس نے پوچھا۔

"مجھے شک ہے فالج کا ایک ہوا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"اوہ گاڈ....." علی کے منہ سے نکلا۔

❁

صبح سارے گھر میں کہرام برپا تھا۔ سبھی پریشان تھے۔ زیب کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ خالدہ بھی رو رہی تھیں جبکہ تائی امی اور سلمٰی چچی انہیں حوصلہ دینے میں لگی ہوئی تھیں۔ خلیل احمد پر فالج کا زبردست حملہ ہوا تھا۔ ان کا ایک سائیڈ پورا فالج کے اثر میں تھا۔ جلیل احمد نے فوراً ہی انہیں ہسپتال میں ایڈمٹ کر لیا تھا جہاں اب انہیں ضروری ٹریٹ منٹ دی جا رہی تھی۔ جلیل احمد اور علی نے ساری رات ہسپتال میں گزاری تھی۔ صبح جب وہ گھر پہنچے تو یہ بری خبر سنتے ہی سب افسردہ ہو گئے تھے۔

"تایا جان! یہ سب کیا ہو گیا..... کل تک تو ابو جی بالکل ٹھیک تھے۔ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟" زیب ان کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور وہ اسے حوصلہ دے رہے تھے۔

شاید یہ قدرت کا انتقام تھا یا صاحب کی آہوں کا نتیجہ جو فالج کی صورت میں اللہ کا قہر خلیل احمد پر نازل ہوا تھا۔ وہ جنہیں اپنی وجاہت، اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا آج ان کا سارا گھمنڈ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک بے گناہ کا دل دکھایا تھا اور اس کی آہوں نے عرش کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ آج وہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ پچھتاووں کی آگ نے انہیں راکھ بنا دیا تھا۔ وہ ٹوٹ چکے تھے۔ کرچی کرچی ہو گئے تھے۔

آخری بار وہ چندن سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اشارے سے علی سے کہا کہ وہ چندن سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے ضرور لائے گا۔

اور پھر جب اس نے چندن کو خلیل احمد کی حالت کے بارے میں بتایا تو وہ تڑپ گئی کہ وہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اس کا باپ تھا۔ اسی کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ خالہ بھی خلیل احمد کی بیماری کا سن کر بہت دکھی ہوئیں۔

''تمہیں ضرور جانا چاہئے بیٹی! خلیل احمد اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے، چلی جا۔'' انہوں نے سمجھایا اور وہ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو خلیل احمد زندہ لاش بنے بستر پر دراز تھے۔ چندن کا دل کانپ اٹھا۔ وہ آگے بڑھی۔

''پاپا.....'' اس نے پکارا اور خلیل احمد نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''پاپا.....'' اس نے پھر پکارا۔ خلیل احمد کے لب ذرا سے پھڑپھڑائے۔ ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے کہ زبان ہی نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چندن بے تابی سے ان کے پاس چلی آئی۔

''یقین کریں پاپا! میں آپ سے نفرت ضرور کرتی تھی۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی آپ کو بد دعا نہیں دی۔ نہ ہی کبھی یہ چاہا تھا۔ پھر ..... پھر کیونکر ہوا یہ سب؟''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ خلیل احمد کیا کہتے۔ بس ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو ان کی زبان بنے ہوئے تھے۔

''میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے ..... مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں۔''

ان کے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی اور علی جو کہ

دروازے ہی میں کھڑا تھا، اس کے دل میں چندن کے لئے پیار اور بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عورت ذات کو اللہ نے معاف کر دینے کی کس قدر صلاحیت عطا کر رکھی ہے۔ وہ خود پر ہونے والے ہر ستم کو ہنس کر سہتی ہے اور جب درگزر کرنے کا وقت آئے تو ہر دکھ، ہر تکلیف بھول کر معاف کر دیتی ہے۔

✲

خالہ اسے چندن کے فلیٹ پر دوبارہ دیکھ کر حیران نہیں ہوئی تھیں۔ وہ یہی سمجھیں کہ شاید وہ انہیں لینے آیا ہے۔

''بیٹا! میں کچھ دن رہوں گی ابھی۔'' وہ گلوری منہ میں داباتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''تو جم جم رہئے ..... میں نے کب منع کیا ہے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''ہیں ..... تو کیا تو مجھے لینے نہیں آیا؟'' وہ حیران ہو گئیں۔

''ہرگز نہیں ..... لیکن آپ اگر چلنا چاہیں تو چلئے۔'' وہ بولا۔

''اچھا تو پھر کیوں آئے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔'' وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''اے بیٹا! ایسی بھی کیا ضروری بات تھی جو تم سے ایک دن بھی انتظار نہ ہو سکا؟'' وہ حیرانی سے بولیں۔

''تھی نا۔ اچھا یہ بتائیں کہ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں آپ؟'' اس نے سوال کیا اور خالہ نے پہلے متعجب ہو کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیں۔

''تو کیا یہی وہ ضروری بات تھی بیٹا جی؟''

''پلیز خالہ! جواب تو دیں۔'' وہ جھلا گیا۔

''دیکھو بیٹا! محبت ناپنے یا تولنے والی چیز نہیں ہوتی کہ میں ناپ تول کر تمہیں بتاؤں۔ یہ تو محسوس کرنے والا جذبہ ہوتی ہے۔ فاطمہ اور عتیل میاں کی اولاد سے زیادہ مجھے ان کے پوتے پوتیوں سے پیار ہے۔ بس اتنا ہی جان لو۔ اور یہ کہ اگر محبت کو لفظوں کی شکل میں ڈھالا جائے تو وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ اس لئے میں لفظوں میں تو نہیں بتا سکتی البتہ اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ تم سب کو بہت چاہتی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔" وہ ٹھہر ے ٹھہر ے سے انداز میں جواب دینے لگیں۔

"اور اگر میں آپ کو اپنی زندگی کے سب سے اہم راز میں شریک کرلوں تو کیا آپ اس کی پاسداری کا عہد کریں گی؟ اور یہ کہ مجھے ایک مسئلے کے حل میں آپ کی مدد بھی چاہئے۔" اس نے تمہید باندھی۔

"کیسا راز؟..... علی! سب خیریت تو ہے .....نا؟" اب کی بار ان کے لہجے میں تشویش کا عنصر تھا۔ علی نے کچھ فاصلے پر بیٹھی چندن کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ خالہ نے اس کی تقلید میں نگاہیں دوڑائیں۔ چندن نے ان دونوں کو ایک نظر دیکھا پھر پلکیں جھکا لیں۔

"میں نے چندن کے ساتھ نکاح کرلیا ہے۔" علی نے لمحہ بھر کی تاخیر کے بعد انکشاف کیا اور خالہ تو جیسے پان چبانا بھول گئیں۔ اس بات سے تو وہ واقف ہو گئی تھیں کہ علی، چندن کی حقیقت جان گیا ہے۔ مگر وہ اتنا بڑا قدم اٹھا لے گا، اس بات کی خبر نہ تھی انہیں۔

"یہ..... کیا، کیا تم نے علی.....؟ کچھ اندازہ ہے کیا کر بیٹھے ہو تم؟ ..... کچھ اندازہ ہے کیسا زلزلہ آئے گا اس گھر میں؟" خالہ نے سر پکڑ لیا۔

"میں نے کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھایا ہے خالہ!"

"ارے غلط ہی تو کیا ہے تم نے۔ جذباتی پن سے کیے گئے فیصلوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے بیٹا۔ میں جانتی ہوں کوئی قبول نہیں کرے گا یہ فیصلہ۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"میرا فیصلہ جذباتی نہیں تھا خالہ! میں پچھتاؤں گا بھی نہیں۔ اسی لئے میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر چندن کو اپنایا تھا۔ مجھے کسی کا ڈر بھی نہیں کہ میں صرف اپنے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔ اور پھر اس سارے قصے میں چندن کا کیا دوش ہے۔ کیا اسے زیب کی طرح عزت سے رہنے کا حق نہیں ہے؟ ..... کیا زیب کی طرح یہ چچا کی بیٹی نہیں ہے؟ اب تو چچا بھی اسے اپنی بیٹی کی حیثیت سے قبول کر چکے ہیں۔ اور آپ بھی تو گواہ ہیں صاحبہ چچی کی پاکیزگی کی، ان کی بے گناہی کی۔ آپ ہی کے ہاتھوں چندن کی پرورش ہوئی ہے۔" وہ بولا۔

"مجھے ڈر اس لئے لگ رہا ہے علی کہ تیرے باپ، دادا تو عزت کی خاطر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی کو بہو کے روپ میں کبھی قبول نہیں کریں گے جس کی ماں غیر خاندان کی تھی۔ بات بہت بڑھ جائے گی بیٹا! اب اس راز کو راز ہی رکھ۔ کسی کو نہ بتانا ہی بہتر ہوگا۔" خالہ بڑی رسانیت سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

"لیکن مجھے چندن کو اس کا حق دلانا ہے، اس کی حیثیت دلانی ہے۔" وہ ضدی پن سے بولا۔ "میں چندن کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اب یہ عقیل فیملی کی عزت بن چکی ہے۔ آپ صرف اتنا بتائیں کہ میرا ساتھ دیں گی کہ نہیں؟" وہ اکھڑ پنے سے بولا تو خالہ نے گہری سانس لی۔ جانتی تھیں کہ اول تو وہ ضد کرتا نہیں ہے لیکن اگر ضد پر آ جائے تو پوری کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اور یہاں تو اب مسئلہ اس کی عزت، غیرت کا آ گیا ہے۔

"بیٹا! جہاں تک تم لوگ مجھے عزیز ہو، وہیں چندن بھی مجھے بہت پیاری ہے۔ ٹھیک ہے، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خلیل احمد کا بویا اب کاٹنا پڑے گا۔ تم بے فکر رہو۔ اللہ تمہاری مشکلیں آسان کرے گا۔ وہ بڑا رحیم اور کارساز ہے۔" انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو خالہ!" علی نے تفکر آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"میں کیسی حرماں نصیب ہوں۔ ہر ایک کے لئے مشکلات اور پریشانیاں ہی پیدا کرتی رہتی ہوں۔ نہ میں علی سے نکاح پر راضی ہوتی، نہ ہی آج انہیں یہ دن دیکھنا پڑتا۔ میری خاطر کتنی پریشانیاں اٹھانی پڑ رہی ہیں انہیں۔" چندن پہلی بار بولی اور خالہ نے اٹھ کر آنسو بہاتی چندن کو گلے سے لگا لیا۔

"یہ سب تو قسمت کی طرف سے ہوتا ہے بچی! قسمت ہی ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے۔ انسان کا اس میں کیا قصور ہے بھلا۔ خو فکر نہ کر، وہ ذات بڑی مسبب الاسباب ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بات کروں گی میں فاطمہ سے۔" وہ اسے تسلیاں دینے لگیں اور علی کے دل میں گہرا اطمینان اتر گیا کہ خالہ کی حیثیت عقیل ہاؤس میں وی آئی پی کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ خالہ ضرور کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گی۔

❁

دن معمول کے مطابق گزر رہے تھے کہ علی کی زندگی میں ایک تبدیلی اور آ گئی۔ اس کو اسپیشلائزیشن کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ قدرے مطمئن تھا کہ چندن کو خالہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ وہ اب اکیلی نہیں تھی۔ اور اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ واپس آتے ہی ماں کو سب کچھ بتا دے گا۔

پھر وہ چلا گیا..... اسے انتظار کی سُولی پر چڑھا کے۔

اس کا ہر دن اسی کے نام سے شروع ہوتا تھا اور اسی کے نام پر ختم ہوتا تھا۔ خالہ نے اس کی اضطرابی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اسے نماز اور قرآن پاک پڑھنے کی صلاح دی۔ صاحبہ نے اسے دین کی تعلیم سے دور نہ رکھا تھا۔ بس اسے کبھی اپنے ماحول کی وجہ سے ڈھنگ سے عبادت کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اب جبکہ اس کی توجہ خالہ نے اس طرف مبذول کرائی تھی تو اس نے بھی لبیک کہا اور بہت عاجزی سے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر آنسو بہائے۔ کتنی کتنی دیر وہ سجدے میں گڑگڑاتی رہتی۔ جھولیاں پھیلا کر نجانے کیا مانگتی رہتی اور اس دوران اس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔

خالہ اسے دیکھتیں اور بے اختیار اس کے حق میں دعا مانگتیں۔ ''یا رب العزت! تُو بڑا بے نیاز ہے۔ تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ اپنی رحمت سے اس بچی کی طرف رجوع فرما۔ اسے سکون دے مالک! آزمائش کے دور کو ختم کر دے۔'' وہ بہت خلوص سے اس کے لئے دعا گو تھیں۔

❁

''علی کے جانے سے گھر کیسا سُونا سُونا ہو رہا ہے۔'' اس دن جب وہ کھانے کے لئے اکٹھے ہوئے تو سلمٰی چچی نے کہا۔ ان کی اور علی کی آپس میں خوب بنتی تھی اس لئے اس کی کمی کو وہ بہت محسوس کر رہی تھیں۔

''ہاں..... اللہ زندگی دے میرے بچے کو۔ ساری رونقیں اسی کے دم سے تھیں۔ اس کے ہوتے ہوئے کبھی گھر میں خاموشی ہی نہ ہوتی تھی۔ رب العزت اسے اس کے مقصد میں کامیاب کرے اور وہ جلد ہی ہم سے آن ملے۔'' دادی بھی اس کی کمی

محسوس کر رہی تھیں۔

''کیوں دادی! کیا ہمارے دم سے اس گھر میں رونقیں نہیں تھیں؟ ہم کوئی فیوز بلب ہیں کیا؟'' کامران نے شکایت کی۔

''ارے میرے بچے! تم سب ہی کے دم سے تو رونقیں ہیں اس گھر کی۔ لیکن علی کی کمی پھر بھی محسوس ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی کام میں الجھا رہتا تھا۔ کبھی کسی سے شرارت کر رہا ہوتا، کبھی باغبانی تو کبھی لطیفے سنا رہا ہوتا۔ اس کی اپنی ہی اہمیت ہے۔ پھر کبھی اتنے لمبے عرصے کے لئے دور بھی تو نہیں ہوا تھا ہماری نظروں سے۔ یاد تو آئے گا۔'' دادی نے بھیگی آنکھوں کے گوشے پونچھے۔

''ہاں دادی! کبھی کبھی ہوتا ہے نا کہ کسی ایک شخص کے دم سے ہی زندگی پُر رونق لگتی ہے۔ اس کی موجودگی، زندگی کا احساس دلاتی ہے اور اس کے نہ ہونے سے دنیا ویران لگتی ہے۔ کتنی اہمیت رکھتا ہے وہ ایک شخص ہماری زندگی میں کہ اس کے بنا ہر خوشی ادھوری لگتی ہے۔ ہر چیز ادھوری لگتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی ذات بھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی اس شخص کی موجودگی میں ہم کو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن اگر جو وہ کہیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے تب احساس ہوتا ہے اس کی اہمیت کا۔ تب ہم جان جاتے ہیں کہ وہ ایک ذات ہمارے لئے کیا درجہ رکھتی ہے۔'' زیب کھوئے کھوئے سے انداز میں کہہ رہی تھی اور وہاں موجود سب لوگ، خاص طور سے کامران اور عرشیہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی خالی پلیٹ اٹھا کے جا چکی تھی۔

''تائی امی! سنا کچھ آپ نے؟'' کامران نے آنکھیں پٹپٹا کے تائی امی کو دیکھا۔

''واقعی امی..... زیب کا بھائی کو اس طرح مس کرنا بہت حیرت کی بات ہے۔'' عرشیہ بولی۔

''حیرت نہیں..... اس صدی کی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات کہو۔'' زوبیہ بھی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

''بزرگوار! کچھ سمجھیں آپ لوگ۔'' کامران معنی خیز لہجے میں بولا اور اس کی بات کو سب سے پہلے سلمٰی چچی سمجھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یعنی اس کا مطلب ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" انہوں نے عرشیہ کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے جھٹ سر ہلا دیا۔

"اے کیا کہہ رہا ہے یہ لڑکا؟" دادی نے نہ سمجھنے والے انداز میں تائی امی سے پوچھا تو جواب میں انہوں نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کر دیا۔

"نہیں سمجھے آپ لوگ اس شریر کا مطلب..... حالانکہ اس کا مطلب بہت صاف ہے۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ علی اور زیب کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہو گی۔" سلمٰی چچی نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی تو خالدہ، تائی امی اور دادی ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں۔

"آگ اور پانی کا ملاپ کہیے چچی جان۔" عرشیہ ہنسی۔

"خالدہ، رقیہ! بچوں کی بات تو دل کو لگتی ہے۔ میں تو ایک عرصے سے سوچے بیٹھی تھی۔ کیا کہتی ہو تم دونوں؟" انہوں نے مسکرا کے بہوؤں کی طرف دیکھا۔

"زیب تو ہمیشہ سے مجھے اپنے علی کے لئے بہت پسند رہی ہے اماں جان! میرا بھی شروع ہی سے خیال تھا مگر میں ذرا علی کے کسی قابل ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب جب بات اٹھی ہی ہے تو میں ضرور اپنا دامن خالدہ اور بھائی صاحب کے سامنے پھیلاؤں گی۔" تائی امی بولیں۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر یہ دونوں ہر وقت جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ کیسے ساتھ رہیں گے؟" خالدہ سادگی سے بولیں۔

"ارے بھابی! آپ نے سنا نہیں کہ جن لوگوں میں ہر وقت ٹوٹو، میں میں ہوتی ہو ان کے دلوں میں دراصل ایک دوسرے کے لئے محبت چھپی ہوتی ہے۔ اور پھر میں نے خود کئی بار علی کو معنی خیز انداز میں زیب سے بات کرتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو کوئی خیال نہیں کیا کہ بچے آپس میں لگے ہی رہتے ہیں۔ مگر اب میرا دل کہتا ہے کہ علی ضرور زیب کو پسند کرتا ہے۔" سلمٰی بولیں۔

"اور اس بات کی گواہی ہم دیتے ہیں۔" نوجوان پارٹی بیک وقت بولی۔

"بس تو پھر بسم اللہ۔ میں بات کرتی ہوں ان سے اور لڑکوں سے۔" دادی کا اشارہ عقیل احمد اور دونوں بیٹیوں کی طرف تھا۔

"دادی تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہیں۔ جن کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے ان سے بھی تو مشورہ کر لیں۔" زوبیہ نے عرشیہ کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ہاں..... صحیح کہا تم نے۔ ان سے بات کرنی تو ضروری ہے۔ کیا پتہ ویسا نہ ہو جیسا ہم سمجھ رہے ہیں۔" عرشیہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"دادی! اگر آپ لوگ ایک بار ان دونوں سے بھی پوچھ لیں تو بہتر نہ ہو گا؟" عرشیہ نے کہا۔

"بیٹا! ہمارے خاندان میں لڑکیوں سے پوچھنے کا رواج نہیں ہے۔ جو فیصلہ کرتے ہیں، بزرگ ہی کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں اپنے خون پر بھروسہ ہے۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔" دادی بڑے یقین سے بولیں۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو....." عرشیہ کے دل سے دعا نکلی۔

زیب اس کی کزن ہی نہیں، بہت اچھی سہیلی بھی تھی۔ وہ اس کی بھابی بن جائے، اس سے زیادہ خوشی کی خبر اس کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔ یوں بھی جب سے خلیل احمد بیمار پڑے تھے، گھر میں اداسیوں نے ڈیرا جما لیا تھا۔ اب جبکہ یہ خوش خبری پھیلی تھی تو جیسے ہر شخص کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ خالدہ بھی بہت مطمئن تھیں۔

دادی نے فی الحال سب بچوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے شوہر اور لڑکوں کے سامنے یہ بات رکھ دی۔ اعتراض بھلا کس کو ہونا تھا۔ سب نے آنکھ بند کر کے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔ خلیل احمد سے بھی پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اشارے سے بخوشی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ طے یہ کیا گیا کہ جب علی اپنا اسپیشلائزیشن مکمل کر کے لوٹے گا تب اس کی شادی کر دی جائے گی۔ منگنی وغیرہ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی کہ سب بڑوں میں بات پکی ہو چکی تھی۔

زیب کو بھی عرشیہ کے ذریعے "اطلاع" مل گئی تھی۔ اس نے احتجاج تو کیا کہ اس کی مرضی بھی معلوم نہیں کی گئی لیکن اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا گیا کہ یہ فیصلہ سب بزرگوں کا مشترکہ فیصلہ ہے لہٰذا انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور وہ لاکھ ماڈرن سہی، اپنے بزرگوں کے سامنے زبان نہ کھول سکتی تھی کہ یہ اس گھرانے کی تربیت کا اثر تھا۔ لہٰذا اسے ان سب کے فیصلے کو قبول کرنا پڑا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تائی امی، علی کو یہ خبر خود سنانا چاہتی تھیں اور اسی غرض سے انہوں نے علی کو فون کیا تھا۔ رسمی سی گفتگو کے بعد جب انہوں نے اسے یہ خبر سنائی جو کہ ان کی سمجھ میں دھماکا خیز خبر تھی اور خوش آئند بھی۔ لیکن علی کے حواسوں پر تو وہ بجلی بن کر گری تھی۔

''کیا..... زیب سے نکاح.....؟'' اس نے جیسے بجلی کے جھٹکے تاروں کو چھو لیا ہو۔

''ہاں بیٹا! بس اب جب تم آؤ گے تب باقاعدہ نکاح کی رسم بھی ادا ہو جائے گی۔'' اس کی حالت سے بے خبر وہ کہہ رہی تھیں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے امی! اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ کم از کم مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔ کیا میں اس قابل بھی نہ تھا؟'' وہ غم و غصے کے عالم میں بولا۔

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے بھلا؟ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ پھر زیب گھر کی بچی ہے، دیکھی بھالی ہے۔ اور تم بھی اسے پسند کرتے ہو۔'' تائی امی بولیں۔

''پلیز امی! میں زیب سے شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ ان کی بات ٹالتے ہوئے قطعی لہجے میں بولا۔

''ہیں، ہیں..... کیا بک رہا ہے لڑکے..... زیب سے شادی نہیں کرے گا؟'' تائی امی اس کے منکے سے جواب پر چکرا گئیں اور زیب جو کسی کام سے اندر آ رہی تھی اس کے قدم وہیں پر رک گئے۔

''امی! انکار کی وجہ ہے میرے پاس اور بہت ٹھوس سبب ہے۔ فون پر نہیں بتا سکتا۔ لیکن پلیز کوئی حتمی فیصلہ مت کیجئے گا۔ میرے آنے کا انتظار کریں آپ لوگ۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''میری ایک بات غور سے سن لو علی! تمہارے پاس چاہے کیسا ہی ٹھوس سبب ہو مگر تمہاری شادی ہو گی تو زیب کے ساتھ۔ سمجھے؟'' انہوں نے قطعی انداز میں کہتے ہوئے ریسیور، کریڈل پر پٹخا اور سر تھام کے وہیں بیٹھ گئیں۔

ادھر زیب سمجھ گئی تھی کہ علی نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیوں اور کس لئے؟ یہ جاننے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ تو اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ علی نے انکار کیا ہی کیوں..... اسے اپنی توہین محسوس ہوئی۔ اس کے رگ و

پے میں یہ احساس توہین تیزی سے اتر گیا۔

کس چیز کی کمی ہے مجھ میں جو تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے..... علی! مجھ جیسی لڑکیوں کے لئے تو لوگ آرزو کئے بیٹھے ہیں اور تم نے انکار کر دیا۔ کس چیز کا گھمنڈ ہے تمہیں..... کس چیز کا فخر ہے؟..... تم نے ہمیشہ مجھے نیچا دکھایا ہے۔ مگر اس بار میں تمہیں زیر کروں گی۔ دیکھوں گی کہ کیسے بچتے ہو مجھ سے..... تم سے شادی کرنے کا شوق نہیں ہے مجھے۔ لیکن صرف تمہیں جیتنے کے لئے کروں گی شادی۔ تمہارا بھی غرور نہ توڑا تو زیب نام نہیں میرا۔ دیکھتی ہوں کیسے انکار کرتے ہو۔

وہ سرخ چہرہ لئے اندر آ گئی جہاں تائی امی ابھی تک سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

''تائی امی!'' اس نے آہستگی سے پکارا تو وہ چونک گئیں۔

''کہو بیٹی۔'' انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

''آپ پریشان ہیں؟'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''نن..... نہیں تو۔'' وہ جلدی سے سنبھلیں کہ کہیں زیب کو علی کے کورے جواب کی بھنک ہی نہ پڑ جائے۔

''ان کا فون تھا نا..... سب سن لیا ہے میں نے۔'' وہ آہستگی سے بولی تو انہوں نے پریشان ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہوں نے انکار کیوں کیا ہے۔ جبکہ وہ تو راضی تھے سو فیصد۔'' وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی اور تائی امی بری طرح چونک گئیں۔

''کک..... کیا مطلب.....؟ کیا واقعی تم دونوں کے بیچ کوئی بات تھی؟'' انہیں سلمٰی چچی کی بات یاد آ گئی۔ زیب نے سر جھکا لیا۔ اگر ایسا تھا تو علی نے کیوں اتنی بڑی بات ان سے چھپائی تھی اور اب انکار کیوں کر رہا ہے؟ کہیں کسی لڑکی کا چکر تو نہیں..... اور بس، یہیں آ کر ان کی سوئی اٹک گئی۔

''ان سے کہہ دیجئے گا تائی امی! کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ مر جاؤں گی۔ اور اگر زندہ بچ گئی تو عمر بھر شادی نہ کروں گی۔ جوگ لے لوں گی۔'' وہ قطعی اور صاف صاف انداز میں کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور تائی امی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ایک بار پھر سوچوں میں ڈوب گئیں۔

❁

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اردگرد کوئی بھی نہ تھا۔

"نجانے سب کہاں گئے۔ اور یہ موئی گھنٹی بھی بجے جا رہی ہے، بجے جا رہی ہے۔ رکتی ہی نہیں۔" خالہ جو اپنے مخصوص تخت پر بیٹھی پان بنا رہی تھیں اس ڈسٹربنس پر جھلا گئیں۔ چند لمحے اور انتظار کیا کہ شاید کوئی آ جائے مگر جب کوئی نہیں آیا تو مجبوراً انہیں فون سننا پڑا۔ ہاتھ کپڑے سے صاف کرتی ہوئی وہ فون تک آئیں۔

"اے آتی ہوں۔ آتی ہوں ..... موا شور کیے جا رہا ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔ پھر انہوں نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو ..... ارے رقیہ! کیسی ہو ..... میں اچھی ہوں ..... تم نے اتنی صبح کیسے فون کر لیا؟ ..... خیریت ہی رکھے اللہ میاں ..... ہاں، بس ذرا کھاریاں گئی ہوئی تھی۔ ابھی دو روز پہلے ہی لوٹی ہوں ..... سلمٰی کی ساس کا انتقال ہو گیا تھا۔ جانا ہی پڑا کہ اس کے سسرال کا معاملہ تھا۔ ورنہ تم ہی جانو اس عمر میں کہاں ہوتا ہے اتنا لمبا سفر ..... ہاں، تم کسی خوش خبری کا ذکر کر رہی تھیں۔ کیا ..... علی اور زیب کی شادی طے ہو گئی ہے ..... اچھا ....."

حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا انہیں۔

"ارے کیوں خوش نہیں ہوں گی بھلا ..... نہیں، ناراض کیوں ہوں بھلا ..... رقیہ! مجھے تم سے بات کرنی تھی بہت ضروری ..... لیکن فون پر مناسب نہیں ہے۔ تم اگر ہو سکے تو دو چار روز کے لئے یہاں آ جاؤ ..... نہیں، خیریت نہیں ہے ..... ہاں، تمہارا آنا بہت ضروری ہے۔ میں ضرور آتی مگر آج کل کمبخت سردیاں ہیں اور اتنا لمبا سفر نہیں طے ہو گا مجھ سے ..... گھٹنوں کی تکلیف نے آدھا کر دیا ہے۔ اچھا اللہ کی امان۔"

ریسیور کریڈل پر رکھے وہ ڈوبتے دل کے ساتھ واپس تخت پر آ بیٹھیں۔ ان کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہے تھے کہ علی اس شادی پر راضی ہوا کیسے؟ کیا چندن کا اسے کوئی خیال نہیں ..... جو اس کے لئے رات رات بھر جاگ کر دعائیں کرتی

ہے۔ دن رات تڑپتی ہے۔ وہ جانتی تھیں کہ علی کیسا لڑکا ہے۔ لیکن باوجود سب خوبیوں کے وہ ایک مرد بھی ہے جس پر کبھی پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا.....

ان میں اتنی ہمت نہیں پیدا ہو رہی تھی کہ وہ اس پگلی لڑکی کو یہ خبر سنائیں جس کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا، علی کو چاہنا اور اس کا انتظار کرنا۔ جس کے وجود میں ایک ننھی سی جان پل رہی تھی۔ اپنے خیالوں میں وہ کچھ اس طرح گم تھیں کہ چندن کے بار بار پکارنے پر بھی نہ چونکیں۔ ہوش میں تب آئیں جب اس نے ان کا شانہ پکڑ کے ہلایا۔

"کیا ہوا نانی ..... کہاں کھو گئی ہیں؟" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں، ہاں ..... ٹھیک ہوں۔ ذرا قہوہ تو بنا لاؤ ایک پیالی۔ بہت طلب ہو رہی ہے۔" انہوں نے اسے ٹالنا چاہا کہ فی الوقت وہ اسے کچھ نہیں بتانا چاہ رہی تھیں۔ چندن الجھی الجھی سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

❁

فون کی گھنٹی بجتی جا رہی تھی۔ زیب قریب تھی۔ لہٰذا اسی نے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو ....." اور اس کی آواز فوراً ہی علی نے پہچان لی۔ "زیب بول رہی ہو؟" اس نے تصدیق کرنی چاہی۔

"جی ہاں ..... مگر آپ کون؟"

"میں علی ہوں۔ سنو! تم اس وقت اکیلی ہو یا کوئی اور بھی ہے اردگرد؟" علی نے تسلی کرنی چاہی۔

"اکیلی ہوں۔" زیب کچھ کچھ سمجھ گئی تھی کہ علی اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

"سنو زیب! تمہیں گھر والوں کے فیصلے کا علم ہے؟"

"جی ....." اس نے مختصراً کہا۔

"تو تم فوراً انکار کر دو۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا تو اسے غصہ آ گیا۔

"خود کیوں نہیں کر دیتے انکار؟" وہ چمک کر بولی۔

"کر چکا ہوں ..... مگر کوئی نہیں سنتا۔ تم کر دو تو شاید ....." علی نے کہنا چاہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"سوری ..... میں ایسا نہیں کر سکتی۔" زیب نے لٹھ مار جواب دینے کے بعد ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ "ہنہ ..... نجانے کیا سمجھتے ہیں خود کو ..... انکار کر دوں۔" وہ تلملا کر سوچنے لگی۔

دوسری طرف علی اس کے اس انداز پر بری طرح جزبز ہو کے رہ گیا تھا۔ اتنا دور تھا کہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج وہ زندگی میں پہلی بار خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"زیب النساء بیگم! اگر تم نے انکار نہ کیا تو بہت پچھتاؤ گی۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اس کے آنے میں دن بہت کم رہ گئے تھے۔ ادھر عقیل ہاؤس میں شادی کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بس علی کی آمد کا انتظار تھا۔ تائی امی تو اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے گھر سے نکل ہی نہ سکی تھیں۔ روز پشاور جانے کا پروگرام بناتیں اور روز ہی رہ جاتیں۔ اسی طرح کرتے کرتے دن گزرتے جا رہے تھے کہ خالہ تہذیب خود ہی چلی آئیں۔ انہیں اس طرح بنا کسی پیغام و اطلاع کے آتا دیکھ کر سبھی کو خوشی ہو رہی تھی۔

خالہ نے آتے ہی تائی امی سے گلہ کیا کہ وہ ان کے بلانے کے باوجود کیوں نہ آئیں۔ جواب میں تائی امی اپنی مصروفیات کا رونا لے کر بیٹھ گئیں۔ پھر ایک دن تو یونہی گزر گیا اور خالہ کو بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن اگلے ہی روز موقع دیکھ کر انہوں نے تائی امی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہاں بیٹھو رقیہ! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" انہوں نے تائی امی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے تو انہیں چندن اور صاحبہ کے متعلق سب کچھ بتایا جسے سن کر وہ ہونق بنی ان کی شکل دیکھتی رہیں۔

"ہائے اللہ! اتنا بڑا راز آج تک سب نے چھپا رکھا تھا۔" انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ہاں رقیہ! کیونکہ اسی میں مصلحت پوشیدہ تھی۔ لیکن اب تمہیں بتانا ضروری ہو گیا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات سننا۔ علی نے شادی کر لی ہے چندن کے ساتھ۔" انہوں نے دھیرے دھیرے بتایا اور جیسے تائی امی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"کیا ..... کیا کہہ رہی ہیں خالہ! یہ کیسا مذاق ہے؟" وہ ڈوبتے ہوئے دل پر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ رکھے بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگیں۔

"یہ سچ ہے ..... وہ سچ جس کا سامنا اب سب کو کرنا ہوگا۔" خالہ نے بڑے رسان سے جواب دیا اور تب تائی امی کو احساس ہوا کہ علی کے انکار کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

"لیکن کیوں کیا اس نے ایسا؟..... ارے کیا افتاد آن پڑی تھی اس پر؟..... یا اللہ! کون سی کسر چھوڑی تھی میں نے اس کی تربیت میں جو آج اس نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔" ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ "ارے کتنا فخر تھا مجھے اپنے بیٹے پر ..... کتنا ناز تھا ..... لیکن اس نے تو میرا سر ہی جھکا دیا۔ نہ جانے کس جرم کی سزا دی ہے اس نے مجھے ..... کیسے کیسے ارمان چھپا رکھے تھے اس دل میں بیٹے کے لئے ..... سب کو آگ لگا دی علی نے۔" آنسو بے اختیار ہو رہے تھے۔ وہ بہت بری طرح ٹوٹ رہی تھیں۔

"ارے اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر اس معصوم بچی سے کیوں کہا کہ وہ اس کا انتظار کرے ..... ہائے زیب، اب کیا منہ دکھاؤں گی تجھے۔" تائی اماں سینہ پیٹ رہی تھیں۔

"کیا ..... کیا مطلب؟" خالہ، زیب کا نام سن کر چونکیں۔

"ارے خالہ! وہ اور زیب پسند کرتے تھے ایک دوسرے کو۔"

خالہ کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ تو اس کا مطلب ہے اس نے چندن کی خاطر اپنے پیار کی قربانی دی ہے۔ خالہ نے تائی امی کی بات سے یہی مطلب نکالا۔

"دیکھو رقیہ! میری بات سنو، اس طرح بین مت کرو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ تم علی کو مت دوش دو۔ اس نے تو ایک طرح سے بھلا کام کیا ہے جو ایک بے سہارا کو سہارا دیا ہے۔ اس نے اگر یہ کام کیا ہے تو اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اس کے دل میں جو نیک جذبہ پل رہا تھا اسی کے نتیجے میں اس نے اپنی محبت کو قربان کرتے ہوئے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔" خالہ انہیں سمجھانے لگیں۔

اور پھر کافی دیر ان کے مابین گفتگو ہوتی رہی۔ خالہ چاہتی تھیں کہ اب وہ چندن کو اپنی بہو کے طور پر قبول کر لیں مگر تائی امی کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ شادی

کے کارڈز بٹ چکے تھے۔ پورے خاندان کو اس بات کی خبر ہو چکی تھی کہ زیب اور علی کی شادی ہونے والی ہے۔ ایسے میں اگر وہ اس رشتے کو توڑ دیتیں تو زیب پر ہی حرف آتا۔ اور پھر چندن کا ماضی اتنا بھیانک تھا کہ وہ صرف قبول تو کر سکتی تھی مگر اسے بہو بنا کے گھر کی عزت نہیں بنا سکتی تھی۔ انہوں نے من ہی من میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ چندن سے خود بات کریں گی۔ خالہ کی زبانی انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ انہی کی حویلی میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسی وقت اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ لائن ملتے ہی اس کی میٹھی سی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو ..... کون، چندن بول رہی ہو؟"

"جی ہاں ..... مگر آپ کون؟" وہ تعجب سے بولی۔

"علی کی ماں بول رہی ہوں۔" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ ..... آپ ..... کیسی ہیں؟"

"اچھی ہوں۔"

"خالہ تو خیریت سے پہنچ گئی ہیں نا؟"

"ہاں ....."

"آپ نے کیسے فون کیا؟" چندن کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

"چندن! مجھے تمہارے بارے میں پتہ لگ چکا ہے اور یہ بھی کہ علی سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔" وہ بلا تمہید بولیں۔

اور چندن کا دل زور سے دھڑکا۔ 'نہ معلوم اب ان کا رویہ کیسا ہوتا ہے.....' وہ سوچنے لگی۔

"تمہیں پتہ ہے زیب تمہاری بہن ہے۔"

"جی ہاں ....."

"تم کتنا چاہتی ہو اپنی "سوتیلی بہن" کو؟" وہ لفظ سوتیلی پر زور دیتے ہوئے بولیں تو لمحہ بھر کو چندن چپ سی ہو گئی۔

"وہ سوتیلی ہی سہی لیکن بہن ہے میری۔ اور اس کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو کہ میری رگوں میں ..... اس ناتے سے وہ بہت عزیز ہے مجھ کو۔" اس نے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سہولت سے جواب دیا۔

"اور علی کو کتنا چاہتی ہو؟" انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

"اپنی جان سے بڑھ کر......" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"اس کی بہتری اور خوشی کے لئے کیا کر سکتی ہو؟" وہ آہستہ آہستہ مطلب کی بات پر آ رہی تھیں۔

"جان بھی دے سکتی ہوں۔"

"تو پھر نکل جاؤ اس کی زندگی سے ...... اس لئے کہ ہم نے علی اور زیب کی شادی پکی کر دی ہے۔" انہوں نے کہا اور جیسے چندن کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ بے جان سی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

"علی اور زیب ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مگر علی نے تمہاری خاطر اپنی محبت کی قربانی دی ہے۔ علی تو یہ دکھ سہار سکتا ہے مگر زیب کو میں جانتی ہوں۔ وہ مر جائے گی علی کے بنا۔ اگر تم ان دونوں کی بہتری اور خوشی چاہتی ہو تو خدا کے واسطے، نکل جاؤ ان کی زندگی سے۔ طلاق لے لو علی سے۔"

وہ بولے جا رہی تھیں اور چندن کو یوں لگ رہا تھا جیسے لحظہ لحظہ اس کی دنیا میں اندھیرا ہوتا جا رہا ہو۔ ایک ایک کر کے ساری روشنیاں بجھتی جا رہی ہوں۔ اسے لگا جیسے وہ ایک بار پھر خالی ہاتھ رہ گئی ہو۔ دوسری طرف وہ لگاتار بولے جا رہی تھیں۔

"زیب ابھی ان تمام حقائق سے بے خبر ہے۔ اور اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ جی نہ سکے گی۔ اس کا مان ٹوٹ جائے گا۔ خالدہ کا سوچو، اس پر کیا بیتے گی؟ اس کا اپنے شوہر سے بھروسا اٹھ جائے گا۔ خلیل بھائی جو پہلے ہی آدھے مردہ ہیں، ان سب کی نفرتیں نہ سہہ سکیں گے اور ...... عقیل ہاؤس کا ہر فرد اس زہریلی سچائی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ تمہارا گھر تو بس جائے گا لیکن یہاں ہم سب کی دنیا اُجڑ جائے گی۔ کیا تم ایسا چاہو گی؟" وہ نفسیاتی حملہ کر رہی تھیں۔

"چپ ہو جائیں ...... پلیز چپ ہو جائیں ...... مجھے جتنا بے حس، جتنا ظالم آپ نے سمجھ رکھا ہے میں اتنی ہوں نہیں۔ میں کسی کے ارمانوں کی قبر پر اپنی خواہشوں کا تاج محل نہیں کھڑا کر سکتی۔ میں عقیل ہاؤس کو ٹوٹنے نہیں دوں گی۔ میں زیب کا گھر

نہیں اجاڑوں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں علی کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میں آج ہی خلع کے کاغذات تیار کروا کر آپ کو بھیج دوں گی۔ علی سے کہئے گا کہ ان پر دستخط کر دے۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتی ہوئی رو دی۔ ایک بار اس نے علی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرے گی اور آج وہ اپنے اس وعدے کو پورا کرنے جا رہی تھی۔ اپنی دنیا میں اندھیرا کر کے ان دونوں کی زندگیوں میں روشنیاں بکھیرنے جا رہی تھی۔

'علی! آج مجھے آپ پر پہلے سے بھی زیادہ ناز ہے کہ آپ نے میری خاطر اپنی محبت قربان کر دی تھی۔ لیکن آج میں آپ کو آپ کی محبت واپس دلانے کا عہد کرتی ہوں۔' وہ سوچ رہی تھی۔

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے
تم سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں
زندگی دیکھ لے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے کمرے تک آئی تو ننھا عاصم لحاف میں لیٹا ہاتھ پیر مارتے ہوئے منہ سے عجیب غوں غاں قسم کی آوازیں نکال رہا تھا۔

چندن اس کے قریب آ گئی۔ ماں کی شکل دیکھتے ہی ننھے عاصم نے رونا شروع کر دیا۔ اس طرح سے گویا وہ اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ چندن نے اسے کانچ کے نازک آبگینے کی طرح احتیاط سے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور سینے سے لگا کے رو دی۔

کتنی خوش تھی وہ کچھ دیر پہلے۔ سوچ رہی تھی کہ علی جب واپس لوٹے گا تو اسے سرپرائز دے گی۔ یہ ننھا سا تحفہ جس نے اس کی ذات مکمل کر دی تھی، پیش کرے گی۔ اس کے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کرے گی ...... مگر اب تو جیسے سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور اس فیصلے پر عمل کرنا پل صراط پار کرنے کے برابر تھا۔ کس قدر جان لیوا عمل ہو گا۔ اذیت کی کیسی گھڑیاں ہوں گی۔ محبت قربانیاں مانگتی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہے ..... اسے بھی قربانی دے کر معتبر ہونا تھا جس طرح علی نے اس کے لئے قربانیاں دی تھیں۔

دو موتی ٹوٹ کر عاصم کے ملائم پھولوں جیسے گالوں پر گرے۔ ماں بننے کا احساس کیسا گدگدا دینے والا ہوتا ہے، اس کا احساس اسے تب ہوا جب وہ اس مرحلے سے گزری تھی۔ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو گویا اس ساری دنیا سے، اس زمین سے، اس آسمان سے، ساری کائنات سے زیادہ معتبر ہو جاتی ہے۔ اس کا رتبہ آسمان جتنا بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے قدموں میں جنت آ جاتی ہے۔ ماں بننے کے بعد کوئی بھی عورت مکمل ہو جاتی ہے۔ وہ بھی مکمل ہو گئی تھی۔ علی نے اسے بیوی کا رتبہ دے کر آدھی عورت بنایا تھا مگر اس ننھی سی جان نے جو اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا اس کو مکمل کر دیا تھا۔ یہ اس کی محبت کی نشانی تھی۔ اس کے وجود کا حصہ ..... اس کی آرزو، اس کا ارمان ..... اس کی کل کائنات۔ اسے ایک مکمل عورت بنانے والا ..... اس کا ادھورا پن دور کرنے والا ..... اسے ماں کے درجہ پر فائز کرنے والا۔

کیسی من موہنی صورت پائی تھی اس نے۔ ماں اور باپ کے حُسن کو چرایا تھا اس نے۔ جب وہ اس کے سامنے پہلی بار لایا گیا تھا تو تب وہ اپنا سارا کرب، ساری اذیت، ساری تکلیفیں بھول گئی تھی جو اس کو اس دنیا میں لانے کے لئے اس نے جھیلی تھیں۔ آج بھی جب وہ اذیت میں تھی تو اس کو سینے سے لگانے کے بعد جیسے وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ کیا ہوا جو علی میرے نہ ہو سکیں گے ..... ان کی نشانی، ان کا عکس تو ہو گا میرے پاس ..... میں ان کی یادوں کے سہارے زندگی کاٹ لوں گی..... رخساروں پر بہتے آنسو انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

اس نے پلکیں موندیں تو علی کا چہرہ نگاہوں میں اتر آیا۔ کتنی عجیب ہوتی ہے یہ محبت، کبھی ہنساتی ہے، کبھی رُلاتی ہے، کبھی سکون دیتی ہے، کبھی تڑپاتی ہے۔ محبت کا ہر دور حسین ہوتا ہے لیکن جب کبھی محبتوں میں جدائیاں آتی ہیں تو انسان تو ٹوٹ جاتا ہے، بکھرتا ہے۔ لیکن اس کی تڑپ میں بھی ایک مزا ہوتا ہے۔ لیکن وہ مطمئن تھی۔ اس لئے کہ اپنے محسن کو اس کی خوشیاں لوٹا رہی تھی۔

''یہ آپ کے لئے ہے بی بی!'' گلاب کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا جو کہ اس نے چندن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ لفافے پر لگی مہروں سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ خط کہاں سے آیا ہے۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے وہ خط کا لفافہ کھولا اور پڑھنے لگی۔ پورا خط پڑھ لینے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور سر بیڈ کی پشت سے لگا لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

❋

آج علی کی واپسی تھی۔ وطن واپس لوٹنے کا خیال، اپنوں سے ملنے کا تصور جہاں اسے مسرور کر رہا تھا وہاں وہ فکرمندی میں بھی گھرا ہوا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے گھر والوں نے اتنا بڑا فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کر کیسے لیا تھا۔ زیب کے متعلق کبھی اس نے ایسے نہ سوچا تھا۔ وہ اس کی چچا زاد تھی۔ اس کے لئے محترم تھی۔ اس سے شادی کے متعلق تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا اس نے۔ جہاں تک چھیڑ چھاڑ کا سوال تھا تو یہ تو اس کی عادت تھی کہ ہر ایک سے مذاق کرتا تھا۔ پھر ان حالات میں زیب کو قبول کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ شاید دوسری صورت میں وہ پھر مان جاتا۔ یہاں تو صورت حال ہی مختلف تھی۔ اس کو یاد تھا کہ اس کے ساتھ پڑھنے والی بے شمار لڑکیاں اس کے خواب دیکھتی تھیں، اس کے قریب آنا چاہتی تھیں۔ کئی ایک نے تو برملا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن اس نے اپنے دل کے کواڑ بند ہی رکھے اور ان پر پڑے قفل کو کوئی لڑکی نہ کھول سکی۔ اس کے سامنے ایک مقصد تھا جسے اس نے پورا کرنا تھا۔ وہ ایسی خرافات میں پڑ کے اپنا مستقبل داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔ لڑکیاں اسے کٹھور اور سنگ دل سمجھتیں۔ مغرور کہتیں۔ لیکن اس کو کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔

پھر اچانک اس کی زندگی میں چندن آ گئی۔ اس قدر حسین لڑکی کو دیکھ کر بھی اس کے دل میں کسی جذبے نے سر نہ اٹھایا تھا کیونکہ اس کے دل و دماغ میں ایک ہی بات جڑ پکڑ چکی تھی کہ جس لڑکی سے وہ شادی کرے گا، جو اس کی دلہن بن کے اس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے گھر آئے گی اسی کے لئے وہ اپنے جذبے ارزاں کرے گا۔ اس نے اپنی ساری محبتیں، سارے جذبے بہت سنبھال کر اس اجنبی لڑکی کے لئے رکھ چھوڑے تھے جسے اس کی زندگی میں بہار بن کے آنا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ محبت وہی سچی اور پائیدار ہوتی ہے جو شادی کے بعد لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے سے ہو جاتی ہے۔ اسی محبت میں سچائی ہوتی ہے اور یہی صحیح معنوں میں ''محبت'' ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے کی محبت، محبت نہیں وقتی جذباتیت ہوتی ہے۔ وہ محبت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ نہ ہی ہمارے مذہب میں اس کا تصور ہے۔ تبھی اگر اس کی زندگی میں کوئی ایسا پل، ایسا لمحہ اگر آ بھی جاتا تو وہ اس ایک پل کی کمزوری پر غالب آ جاتا۔ اپنی مستقل مزاجی اور اپنے کردار کی مضبوطی کی بناء پر ہی وہ ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ تھا۔

لیکن چندن جس طرح سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی وہ خود بھی بوکھلا گیا تھا۔ چندن سے اسے محبت نہ تھی۔ وہ تو بس اسے اس دلدل سے نکالنا چاہتا تھا۔ اسے اس کا حق دلانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو ایک محفوظ، باعزت زندگی دے جس کی تمنا وہ کر رہی تھی۔ جو اس کا حق بھی تھا۔ اس کا واسطہ کب ایسی لڑکی سے پڑا تھا۔ زندگی کے بھیانک رخ کو اتنے قریب سے دیکھ کر وہ کانپ اٹھا تھا۔ لیکن وہ پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ ایک نئی زندگی گزارنا چاہتی تھی تو علی نے بھی اسے تحفظ دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چندن سے نکاح سے قبل اس کے دل کے کواڑ اسی طرح بند تھے۔ مگر نکاح کے بعد ہر تالا کھل گیا اور اس خالی مکان میں چندن آ کے بس گئی۔ دل کی ہر دیوار جو اب تک سادہ تھی اب یہاں چندن کی تصویریں آویزاں تھیں۔ وہ اس کو چاہنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب جو اس کی زندگی میں وہ شامل ہو چکی ہے، وہ اپنا ہر جذبہ اس کے نام کر چکا ہے تو اس کے بعد اس کی زندگی میں کسی اور لڑکی کے لئے قطعی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہاں زبردستی زیب کو اس کی زندگی میں شامل کیا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں آتے ہی پہلا کام یہ کرے گا کہ پہلی ہی فرصت میں ماں کو چندن کے بارے میں بتا کر یہ شادی رکوا لے گا۔

جس وقت وہ ٹرالی پر سامان رکھوا رہی تھی، تبھی گلاب نے اسے ٹہوکا دیا۔

''بی بی صاحب.....!''

اس نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھا۔

''کک..... کہاں.....؟'' اس نے پھیکے پڑتے ہوئے چہرے پر سے پسینہ پونچھا۔

''ادھر، وہ رہے۔'' گلاب نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو چندن نے اس طرف نگاہوں کا زاویہ کیا۔ علی ٹرالی گھسیٹتا ہوا باہر ہی آ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اس لئے اس کی نگاہ ان لوگوں پر نہ پڑی۔

''یا اللہ.....'' چندن کے دلسے نیں اٹھی۔ ''جلدی کرو..... سامان اندر لے چلو۔''

چندن نے گلاب کے ہاتھ سے عاصم کو لیتے ہوئے نہایت عجلت میں کہا۔

''صاحب سے ملیں گی نہیں؟'' وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

''نہیں..... اور تم سے جو کہا ہے وہی کرو۔'' چندن سختی سے بولی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ گلاب نے بھی اس کی پیروی کی۔

علی کی متلاشی نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

'اطلاع تو کر دی تھی۔ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟' اس نے سوچا۔ اسی وقت اشعر اور کامران اسے نظر آ گئے۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب.....'' اشعر وارفتگی سے آگے بڑھتے ہوئے اس کے گلے سے لگ گیا۔

''کہاں غائب تھے یار؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''ٹریفک میں پھنس گئے تھے یار!'' اشعر بولا اور جلدی جلدی اس کا سامان کار کی ڈکی میں رکھنے لگا جبکہ کامران ابھی تک اس سے بغل گیر تھا۔

''اب بس بھی کرو..... گھر جا کے چپک جانا اس سے۔'' اشعر نے پیچھے سے آواز دی تو وہ مسکراتے ہوئے الگ ہو گیا۔

''باقی سب کیسے ہیں؟'' کار میں بیٹھنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"سب ٹھیک ہیں ..... بڑی بے صبری سے انتظار ہو رہا ہے۔" کامران نے جواب دیا۔

"ظاہر ہے بھئی، وی آئی پی جیسی حیثیت تو ہوتی ہی ہے۔ لندن سے جو آ رہے ہیں موصوف۔" اشعر کار کی اسپیڈ تیز کرتے ہوئے بولا تو علی مسکرانے لگا۔

"تُو کیسا ہے.....؟" علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اشعر سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ..... تُو اپنا سنا۔"

"سامنے ہوں تمہارے ..... کیسا لگ رہا ہوں؟"

"پہلے سے بھی زیادہ زبردست۔" اشعر نے محبت سے اسے دیکھا پھر ایئرپورٹ سے عقیل ہاؤس تک کا راستہ یونہی ہنسی مذاق میں گزرا۔

گھر پہنچتے ہی اس پر پہلی نظر بوا کی پڑی جو کیاریوں سے مرچیں توڑ رہی تھیں۔ علی کو کار سے نکلتے دیکھ کر انہوں نے وہیں سے "سائرن" بجانا شروع کر دیا۔

"ارے علی بیٹا آ گیا ..... ارے علی آ گیا ہے لڑکیو! کہاں ہو سب کی سب .....! باہر آؤ۔" اور علی مسکراتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔

"آداب بوا! کیسی ہیں آپ؟"

"اچھی ہوں بیٹا! شکر ہے میرے مالک کا کہ اس نے میرے بچے کی شکل دکھائی ہے مجھے۔" وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں اور اپنی بھیگی آنکھیں دوپٹے سے صاف کیں۔

علی کی آمد کی خبر منٹوں میں گھر بھر میں پھیل گئی۔ کیا بڑے، کیا چھوٹے، اماں و خیراں سبھی باہر نکل آئے۔ اس کے اندر آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ پھر سب سے پہلے جس ہستی کو وہ اپنی بانہوں کے حصار میں لئے محبت و ممتا کے خزینے وصول کر رہا تھا وہ تائی امی تھیں۔ وہ اپنی ہر نارضگی بھلائے اس سے لپٹی باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ اکلوتا اور لاڈلا بیٹا ایک طویل جدائی کے بعد مل رہا تھا ان سے۔ دو سال کہنے کو تو صرف دو ہی سال ہوتے ہیں لیکن کوئی ان کی مامتا سے پوچھتا انہوں نے ان دو سالوں کے سات سو تیس دن اور ان سات سو تیس دنوں کی ان گنت ساعتیں اس کی یاد میں روتے ہوئے اس کے انتظار میں گزار دی تھیں۔ جب ان کا دل اس کی

صورت دیکھنے کو تڑپتا تھا، ان کے کان اس کی آواز سننے کو ترستے تھے، ان کی بانہیں اسے سمیٹنے کو مچلتی تھیں، کتنا تڑپتی تھیں وہ اس کے لئے۔ اور اب جبکہ انتظار کا ہر لمحہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا تو ان کی بے چین روح اور بے تاب دل کو قرار آ گیا تھا۔ کیسا مطمئن ہو گیا تھا ان کا دل۔

وہ باری باری سب سے ملا۔ پھر ان کے جمگھٹے میں وہ اندر چلا آیا۔ باتوں کے دوران وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ سب اس کی خاطر مدارات میں لگے تھے۔ وی آئی پی کی حیثیت حاصل تھی اسے۔ وہ راجہ اِندر بنا سب کے درمیان بیٹھا تھا۔ زیب کہیں بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ اس پر ایک عجیب سی بے کلی طاری تھی۔ وہ ماں سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔ لیکن یہ لوگ اسے موقع ہی نہیں دے رہے تھے۔ عرشیہ، کامران، زوبیہ وغیرہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔ اشعر تو اسے گھر چھوڑ کے کب کا جا چکا تھا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چندن کے متعلق اس سے کچھ پوچھے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ بھائی وہاں سے گوری چٹی میم ساتھ لائیں گے لیکن یہ تو خالی ہی چلے آئے۔" عرشیہ شوخی سے کہہ رہی تھی۔

"اگر یہ حضرت کسی گوری، نیلی، پیلی قسم کی میم کو ساتھ لے آتے تو زیب کی پنسل ہیل کی سینڈل سے وہ مرمت ہوتی کہ پھر کوئی میم تو کیا کسی بھی خاتون کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھول جاتے۔" کامران ہنس کے بولا۔

"اگر میں کوئی میم ٹائپ چیز لے بھی آتا تو میرا ہیڈک ہوتا۔ ان محترمہ کو کیا تکلیف ہوتی؟" وہ جل کر بولا۔

"ذرا زیب کے سامنے کہیں یہ بات ..... پھر بتائے گی وہ آپ کو۔" عرشیہ بولی۔

"چیلنج کر رہی ہو؟" علی نے اسے گھورا۔

"اوں ہوں ..... برے وقت سے بچنے کا مشورہ دے رہی ہوں۔" وہ ہنسی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ زیب کہاں ہے؟" علی نے سنجیدگی سے پوچھا تو سب لوگ ہنسنے لگے۔

"کچھ شرم کرو، قابو رکھو اپنی بے تابیوں پر شادی تک۔ کیونکہ اماں جی نے زیب

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کا پردہ کرانا شروع کر دیا ہے۔" سلمٰی چچی جو جوس کا گلاس لے کر اس کی طرف آ رہی تھیں اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولیں۔

"لیکن کیوں.....؟" علی نے بے ساختہ پوچھا تو وہ سب مسکرانے لگے۔

"وہ اس لئے کہ ایک دو روز میں آپ دونوں کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔ اور شادی سے پہلے ہمارے ہاں رواج ہے کہ دلہن کا دلہا سے پردہ کرایا جاتا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر وضاحت کی اور گلاس اسے تھما کر خود کچن کی طرف چلی گئیں۔ جبکہ اس کے ہونٹوں سے ایک دم ہی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں عرشی! مجھے ایک گھنٹے بعد جگا دینا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور پھر فوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ الجھا الجھا سا بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہو رہا تھا کہ اسے کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل رہا تھا۔

اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے ایک بند لفافے پر پڑی تو وہ چونک گیا۔ ایک رجسٹری تھی جو اسی کے نام تھی۔ اس نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ٹکٹوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رجسٹری ملکی ہی ہے۔ اس نے لفافہ کھولا تو اس سے دو تہہ شدہ کاغذ نکلے۔ ایک کاغذ شاید کوئی خط تھا جبکہ دوسرا کاغذ اس نے کھول کر دیکھا تو چکرا کے رہ گیا۔ یہ خلع نامہ تھا..... اس نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے جلدی سے خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ خط چندن کا تھا جو اسی کے نام تھا۔

"کیا نام دوں آپ کو..... مسیحا کہوں یا فرشتہ..... محبوب کہوں یا غم گسار..... بہرحال آپ جو بھی ہیں میرے اپنے ہیں۔ میرے دل میں مقیم ہیں۔ میری پہلی اور آخری تمنا ہیں۔ میری دعاؤں کا حاصل ہے۔ علی! آپ وہ ہیں جس نے مجھ جیسی بے مایہ لڑکی کو وہ عزت دی کہ میں دیوانی ہو گئی۔ اتنی محبت دی، اتنی خوشیاں دیں کہ میرا دامن چھوٹا پڑ گیا۔ لیکن میں کتنی کم ظرف ہوں کہ آپ کے اتنے احسانوں کے بدلے میں نے آپ سے آپ کی خوشیاں چھین لیں، آپ کے سپنے توڑ دیئے۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ کیسی لڑکی ہے یہ..... میرا خط دیکھ کر حیران مت

ہوں..... خط لکھنا میری مجبوری تھی۔ کیونکہ میں اب جو آپ سے مانگنے جا رہی ہوں وہ میں آپ سے روبرو نہیں مانگ سکتی۔ اس لئے خط کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ علی! میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی شخص کو چاہا ہے اور وہ آپ ہیں۔ آپ وہ ہیں کہ جن کو دیکھ کر مجھے لگا کہ ہاں، کوئی تو "انسان" ہے آدم خوروں کی اس بستی میں جسے اس بے مایہ لڑکی کے جذبات کا احساس ہے۔ جو مجھے کھلونا نہیں سمجھتا..... بلکہ ایک انسان ہی سمجھتا ہے۔ آپ کتنے عظیم ہیں علی کہ اپنے دل پر جبر کر کے، اپنی محبت کو آگ لگا کے میری دنیا سنوارنے میرے پاس چلے آئے۔ مجھے سب پتہ لگ گیا ہے علی کہ آپ زیب سے محبت کرتے ہیں اور صرف میری وجہ سے اس کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا۔"

"ہیں..... یہ کیا بکواس ہے..... میں زیب کو چاہتا ہوں اور خود مجھے اس کی خبر نہیں ہے.....؟" اس کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"علی! میں آپ کو بہت چاہتی ہوں مگر میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ اور آپ سے منسلک ہر چیز کی بہتری کے لئے جان سے بھی گزر جاؤں گی، سو آج میں وہی کرنے جا رہی ہوں..... میں آپ کے اور زیب کے راستے سے ہٹ جانا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ میرا منحوس سایہ کہیں آپ دونوں کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔ اسی لئے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں یہ ملک ہی چھوڑ دوں۔ میں جا رہی ہوں یہ ملک، یہ سرزمین چھوڑ کر..... آپ کی زندگی سے بہت دور..... خلع کے کاغذ اسی خط کے ساتھ مل جائیں گے۔ ان پر دستخط کر دینا اور نیچے جو ایڈریس لکھا ہے اسی پر ارسال کر دینا۔ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ آپ کی یہ کوشش رائیگاں جائے گی۔ میرا اتا پتہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس جگہ جا رہی ہوں۔ آپ سے ملے بغیر اس لئے جا رہی ہوں کہ آپ کو سامنے دیکھ کر کہیں میرے قدم نہ ڈگمگا جائیں۔ اور اب میں اپنے فیصلے سے ہٹنا نہیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چاہتی۔ یہ کاغذات میرے وکیل کے پاس میری امانت ہوں گے جو بعد میں مجھے ازخود مل جائیں گے۔ ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ میرا پیچھا کرنا فضول ہوگا..... علی! میری فکر مت کرنا۔ آپ کی نشانی عاصم کی صورت میں میرے ساتھ رہے گی۔ اور ہاں ..... زیب کو کبھی کچھ مت بتانا۔ اس راز کو یہیں دفن کر دیں۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے اور شاید یہی قسمت کو منظور ہے۔ جو پل آپ کے ساتھ گزارے ہیں وہی میرا کل اثاثہ ہوں گے۔ آپ کی یادوں کے سہارے میں زندگی کے دن گزار دوں گی۔ ہو سکے تو مجھ کو معاف کر دیجئے گا۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ دونوں کے ساتھ رہیں گی۔ خدا نے اگر چاہا اور قسمت نے ساتھ دیا تو شاید زندگی کے کسی موڑ پر آپ کی ملاقات آپ کے بیٹے سے ہو جائے۔ اب اجازت دیں، اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے..... آپ کی چندن!''

علی نے تھکے تھکے سے انداز میں خط کو تہہ لگائی۔

''یہ کیا، کیا تم نے پاگل لڑکی ..... کم از کم میرا انتظار تو کیا ہوتا ..... اتنا بے بس تو نہ تھا کہ تمہیں یوں اکیلا چھوڑ دیتا۔ کہاں تلاش کروں گا اب تمہیں؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے گود میں پڑا خلع کا کاغذ دیکھ رہا تھا۔

وہ بہت افسردہ افسردہ سا اپنے بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ رکھے تھے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ چندن اسے بری طرح یاد آ رہی تھی۔ اس کے سنگ گزرا ایک ایک لمحہ، ایک ایک بات ..... جتنی جلدی وہ اس کی زندگی میں آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے نکل بھی گئی تھی۔ اس نے پہلی بار کسی سے محبت کی تھی اور پہلی ہی بار اس محبت میں جدائی کا زہر بھی پینا پڑ گیا تھا۔ وہ اس کی پہلی محبت تھی۔ اس لئے اس کے نقوش کو اپنے دل و دماغ سے کھرچنا بھی بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پھر اپنے بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر وہ اور بھی افسردہ ہو گیا تھا۔ اس نے تو اس معصوم کی تصویر تک نہ دیکھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ خالہ نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اس بات کی بھی الجھن ہو رہی تھی کہ چندن نے کیسے

سمجھا کہ وہ اور زیب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ نہ جانے کس نے اُڑائی ہے یہ افواہ۔ نہ جانے کس نے اس سے دشمنی کی ہے۔

انہی سوچوں میں وہ غلطاں تھا کہ تائی امی اندر چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تھک گئے ہو بیٹا؟'' وہ پیار سے اس کے بکھرے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولیں۔

''بہت تھک گیا ہوں امی .....'' وہ تھکی تھکی سی سانس لیتے ہوئے گویا ہوا۔

''اچھا تو پھر آرام سے سو جاؤ۔'' انہوں نے محبت سے اس کو دیکھا جس کا رنگ روپ مزید نکھر گیا تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' اس نے مسکرا کے پوچھا۔

''نظر اتار رہی ہوں اپنے چاند کی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہاں کیا کیا کھاتے تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہاں تو بس فاسٹ فوڈز پر ہی گزارا ہوتا تھا۔ کبھی، جی اوب گیا تھا بدمزا کھانے کھا کھا کر۔ سچ امی! اپنے ملک، اپنے لوگوں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وطن سے دور رہ کر وطن کی قدر ہوتی ہے۔ یہاں کی گلیاں، کوچے، بازار، کھانے، لوگ سب بہت یاد آتے ہیں۔''

''ہاں بیٹا! اپنے دیس، اپنے لوگوں جیسا تو کوئی نہیں ہوتا۔ ان کا نعم البدل ملنا ممکن نہیں ہے۔'' انہوں نے اس کی تائید کی۔ پھر جب انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں تو تب علی نے سوچا کہ ان سے بات کر لی جائے۔ لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔ تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کا ارمان پورا کر لوں۔'' وہ مطلب کی بات پر آ گئیں۔

''میں بھی اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا امی ..... دراصل بات یہ ہے کہ میں ..... میں ..... شادی کر چکا ہوں۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ لیکن تائی امی نہ چونکیں۔ اس لئے کہ وہ سب باتوں سے واقف تھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں جانتی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولیں تو علی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"کیا..... آپ کو معلوم ہے؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ لڑکی کون ہے؟" اس نے بغور ماں کو دیکھا۔

"ہاں....."

"اور اس کے باوجود بھی آپ نے زیب سے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"دیکھو بیٹا! یہ شادی بیاہ کے معاملات بہت سنجیدہ ہوتے ہیں۔ کوئی کھیل مذاق نہیں ہوتے۔ یہ نسلوں کا معاملہ ہوتا ہے۔ تم نے چندن جیسی لڑکی سے نکاح کرنے سے پہلے ذرا بھی نہ سوچا کہ اس طرح ہماری عزت، ہمارے نام پر کتنا حرف آ سکتا ہے۔ آخر ایسا احمقانہ فیصلہ کیا کیسے تم نے؟"

"امی! جب ساری باتوں کا پتہ چل ہی گیا ہے آپ کو تو پھر بتائیں مجھے کہ اس سارے قصے میں چندن یا صاحبہ چچی کا کیا قصور ہے؟ آپ لوگ انہیں قصور وار سمجھ رہے ہیں جبکہ ان کی بربادی کی وجہ چچا ہیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے بیٹا! میں سمجھتی ہوں سب۔ لیکن چندن کو ایسی حالت میں کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟" انہوں نے سمجھانا چاہا۔

"جیسے میں نے قبول کیا ہے اسے۔ کیا آپ لوگ اسے قبول نہیں کر سکتے؟" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"تمہاری آنکھوں پر تو پٹی بندھ چکی ہے۔ لیکن ہم اپنی آنکھیں اور کان کھولے بیٹھے ہیں بیٹا جی! یہ دنیا ہے اور یہ دنیا اس قسم کی لڑکیوں کو کبھی بھی اپنے برابر جگہ نہیں دے سکتی۔ تم اس حقیقت کو سمجھو اور اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کو اتار پھینکو۔ خلیل احمد کی غلطی کو مت دہراؤ۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ چندن کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور ہم کو اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ سب کے درمیان۔ ہم کو لوگوں کی پرواہ بھی کرنی ہوتی ہے۔"

"لیکن مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"اچھا..... کیا تمہیں زیب کی بھی پرواہ نہیں ہے، جس سے تم نے وعدے کئے، قسمیں کھائیں ..... اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر اس معصوم سے محبت کا کھیل کیوں رچایا؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں اور علی گنگ سا ان کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔ پہلے بھی وہ ایک دفعہ فون پر اس قسم کی بات کر چکی تھیں اور آج تو انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔

"کیا..... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ ششدر رہ گیا۔

"بس بیٹا! بہت ہو چکا مذاق۔ زیب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"ہیں ..... کیا بتا دیا ہے؟" وہ بوکھلا گیا۔

"تم نے مجھ سے اتنا بڑا راز چھپایا ہے، میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن اب تمہیں چندن کو طلاق دے کر زیب سے شادی کرنی ہی ہو گی۔ تم زیب کو زبان دے چکے ہو اور زبان سے پھرنا مرد کی شان نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں؟ کون سا وعدہ ..... کیسا وعدہ .....؟ امی! یہ بہتان ہے مجھ پر۔ جھوٹ بولا ہے زیب نے۔ آپ اپنے بیٹے کو نہیں جانتی ہیں؟ میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟ میں نے تو کسی غیر لڑکی کی طرف بھی کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، زیب تو پھر میری چچا زاد ہے، میرے لئے قابل احترام ہے۔ میرا یقین کریں۔" وہ پٹی بے گناہی پیش کر رہا تھا۔ لیکن تائی امی تو کسی طرح یقین کرنے کو تیار نہ تھیں۔

"دیکھو علی! میں تم کو اچھی طرح جانتی ہوں اور میں زیب کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ کوئی بھی کنواری لڑکی اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ پھر اس نے خود میرے سامنے اعتراف کیا ہے۔ اب تو جھوٹ کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے چندن سے نکاح محض ازراہ ہمدردی کیا ہے۔ ورنہ محبت تو تمہیں زیب ہی سے ہے۔ بس اب ختم کرو یہ سب۔ تم چندن کو طلاق دے دو۔" وہ اس بار رسانیت سے سمجھا رہی تھیں۔

"پلیز امی! میں کہہ چکا ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔ اس کا دماغ اس جھوٹ پر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ زیب سے اسے اتنے بڑے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جھوٹ کی توقع ہرگز نہ تھی۔

"اگر تم نے میری بات نہ مانی علی! تو میں دودھ نہیں بخشوں گی تمہیں۔" انہوں نے دھمکی دی۔

"مت مجبور کریں مجھے۔" وہ جھلا گیا۔

"تم نے چندن سے چپکے چپکے نکاح کر کے میرا اعتبار توڑا ہے علی! اور جب ماں کے بھروسے کا آئینہ ٹوٹتا ہے تو اس کی کرچیاں بڑی دور تک بکھرتی ہیں۔ تم جو میرے اتنے تابعدار بیٹے تھے، اب صرف ایک لڑکی کی خاطر اپنی ماں کو جھٹک رہے ہو۔ یقین نہیں آتا ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بیڈ پر بے دم ہو کر بیٹھ گئیں۔

"امی.....!" علی ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"مت چھو مجھے ..... ارے کیسا انسان ہے تُو .....؟ معاملے کی سنگینی کا احساس ہے نہ کسی کے جذبات کا ..... ماں کا دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے۔ زیب پر تیرے انکار سے جو انگلیاں اٹھیں گی تو اٹھتی رہیں۔ اس خاندان کی عزت مٹی میں ملتی ہے تو ملتی رہے۔ تیری بلا سے۔ تجھے تو اپنی چندن کو خوش رکھنا ہے نا۔ مگر یاد رکھ کہ ماں کا دل دُکھا کر تُو کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔" وہ اپنے ہاتھ چھڑاتی ہوئی غصے سے بولیں۔

"میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں آپ؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"تُو مان جا میری بات بیٹا! ضد مت کر۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔

"ٹھیک ہے امی! اگر آپ مجھے زیادہ مجبور کریں گی تو میں یہ گھر ہی چھوڑ جاؤں گا۔ یہی بہتر ہوگا۔" اس نے آخری فیصلہ سنایا۔

"تُو مجھے چھوڑ جائے گا، اپنی ماں کو.....؟" ان کی آواز رندھ گئی۔

"آپ لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے یہ قدم اٹھانے پر ..... میں آپ سے بھی بہت محبت کرتا ہوں، لیکن میں چندن کو بھی بہت چاہتا ہوں۔ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے معاف کر دیں۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے کہہ رہا تھا اور یہ کہہ کر وہ اٹھا ہی تھا کہ ایک دم تائی امی اس کے سامنے آ گئیں اور اپنے سر پر اوڑھی ہوئی سفید اُونی

شال اتار کر اس کے سامنے ڈال دی..... یہ لمحہ تھا یا قیامت آ گئی تھی ..... اس کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ جیسے کسی نے بھرے مجمع میں اس کو طمانچہ مار دیا ہو۔

"امی ..... یہ ..... یہ....." اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شال اٹھائی اور ان کے سر پر ڈالتے ہوئے انہیں بانہوں میں بھینچ لیا۔ پھر ایک دم ان کے پیروں پر گر گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اتنے لمبے چوڑے جواں مرد کی آنکھوں سے آنسو سیلاب کی طرح بہتے ہوئے ماں کے پیروں کو غسل دے رہے تھے۔

"اتنا گناہ گار کر دیا آپ نے مجھ کو ..... اتنا پستیوں میں گرا دیا ..... میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی آپ نے ..... اتنا ذلیل کر دیا مجھے ..... خدا مجھے کیسے معاف کرے گا۔" اس کی آواز میں ارتعاش نمایاں تھا۔

"مجھے روکنے کا دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔" انہوں نے شانوں سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"ٹھیک ہے امی ..... میں ہار گیا ہوں ..... آپ کے جو جی میں آئے، کریں۔ میں چندن کو طلاق دے رہا ہوں۔" شکستہ لہجے میں اس نے وعدہ کر لیا کہ ماں کی حرمت سے آگے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

"جیتے رہو میرے بیٹے! ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔ رب العزت تجھے ہمیشہ سرخرو کرے۔ خوش رکھے، آباد رکھے۔" انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے دعائیں دیں۔

"آپ کو کیا پتہ، آپ کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ لیکن کسی کی پوری زندگی خاکستر ہو گئی ہے۔ آپ مجھے مجبور نہ کرتیں تو میں اسے ڈھونڈ نکالتا، لیکن اب تو وہ جواز ہی ختم ہو جائے گا۔"

وہ ساری رات اس پر بہت بھاری تھی۔ ماں کو مطمئن کر دیا تھا لیکن اپنا سکون و اطمینان جیسے کھو بیٹھا تھا۔ وہ رات قیامت سے بھاری تھی۔ ہر ہر گزرتا لمحہ اس کی بے چینی و اضطراب میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے طلاق نامے پر دستخط کیے اور پھر اگلے ہی دن اسے چندن کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پوسٹ کر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ زیب سے اسے پہلی بار شدید ترین نفرت محسوس ہوئی۔ وہ اس کو ان تمام باتوں کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اس نے اتنا بڑا بہتان لگایا تھا اس پر۔ اس کی نیک نامی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ جس نے چندن کے سامنے، اس کی ماں کے سامنے اسے قصوروار بنا کے پیش کر دیا تھا۔ لیکن اس نے ایسا کیا ہی کیوں؟...... کیوں ایک جھوٹ بول کر اس کی آسودہ زندگی میں بے اطمینانی بھر دی۔

'مجھے تم سے نفرت ہے...... تم نے جھوٹ بول کر میرا تو سب کچھ بگاڑا ہے مگر میں تمہارا بھی بھلا نہ ہونے دوں گا...... تم نہیں جانتیں کہ جس راستے کا انتخاب تم نے کیا ہے وہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ اب بھگتنا، کیوں کہ میری ہم سفری میں تو تمہیں صرف آنسو ہی ملیں گے...... آہیں اور نفرتیں تمہارا مقدر ہیں...... کبھی معاف نہیں کروں گا تمہیں...... کبھی نہیں۔' وہ غم و غصے کے عالم میں سوچ رہا تھا۔

❋

شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ شور و غل مچا ہوا تھا کہ اللہ کی پناہ۔ گھر کے سارے افراد گھن چکر بنے ہوئے تھے۔ علی چپ سا ہو گیا تھا۔ ان سب ہنگاموں سے اسے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔

زیب کو دس دن پہلے ہی بقکم دادی، مایوں بٹھا دیا گیا تھا اس لئے وہ اس سے چاہنے کے باوجود بھی نہ مل سکا کہ اس سے صرف اتنا پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اس نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا؟ اس پر تو جیسے پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ اس نے بھی زیادہ گڑبڑ نہ کی کہ شادی کے بعد تو اچھی طرح سے "حساب" لینا ہی تھا۔

اس نے ہسپتال جوائن کر لیا تھا اور اب ہسپتال میں حسب منشا تبدیلیاں لا رہا تھا۔ جو کچھ اس نے باہر سے سیکھا تھا اب وہ تجربہ اس نے اپنے ہسپتال کو مزید بہتر بنانے میں صرف کیا تھا۔ وہ بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا بلکہ اس نے خود کو مصروف بنا لیا تھا۔ گھر سے صبح نکلتا تو رات گئے ہی لوٹتا تھا۔ کبھی کبھی اگر جلدی فارغ ہو جاتا تو ساحل سمندر کی طرف نکل جاتا۔ جہاں کی خاموشی میں وہ سمندر میں اٹھکیلیاں لیتی لہروں کے گیت سنتا رہتا۔ گھر میں جو ہنگامے ہو رہے تھے وہ ان سے تنگ آ چکا تھا۔ بہن بھائیوں کی چھیڑ چھاڑ سے بیزار تھا۔ زیب کے ذکر پر اس کا حلق تک کڑوا ہو جاتا

تھا۔ ماں کی ڈانٹ، دادی کی ہیبت، سلمیٰ چچی کی تاڑیں، لڑکیوں کے مذاق کسی بھی چیز کا اثر نہ ہو رہا تھا اس پر۔ اس نے اپنی روٹین نہ بدلی بلکہ حد تو اس دن ہو گئی تھی جب شام کو اس کی مہندی کی رسم تھی۔ سارے مہمان، سب لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے اور وہ ہسپتال میں اپنے کسی مریض کا چیک اپ کرنے میں مگن تھا۔ ادھر تائی امی کا انتظار کر کر کے برا حال ہو رہا تھا۔

"اے کامران! یہ لڑکا نہیں آیا ابھی تک۔ سارے مہمان جمع ہیں، سب رسمیں کرنی ہیں اور اس کا پتہ ہی نہیں۔ ذرا دوبارہ فون کر کے بلاؤ اسے۔ کیا گوند لگا کر چپک گیا ہے ہسپتال میں۔ حد ہے بھئی، خود کی شادی پر یہ حال۔" ان کا غصے اور کوفت کے مارے برا حال تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کان سے پکڑ کے اسے لے آئیں۔ کامران فوراً فون کرنے چلا گیا جبکہ وہ بے قراری سے وہیں ٹہلتی رہیں۔ پھر جب چین نہ پڑا تو کامران کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ لیکن راستے میں اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"کیا کہتا ہے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"کہہ رہے ہیں کہ ایک مریض کو چیک کر کے آ رہا ہوں۔ آپ اپنی رسمیں ادا کریں، میری فکر چھوڑیں۔" اس نے حرف بہ حرف علی کے الفاظ دہرائے۔

"بھاڑ میں جائے اس کی ڈاکٹری اور چولہے میں جائے ہسپتال۔ ملاؤ نمبر۔ کرتی ہوں میں خود اس سے بات۔ نہ مانا تو جوتے مارتی ہوئی لاؤں گی گھر۔ حد ہو گئی، انوکھے دولہا ہیں یہ کہ شادی یہاں تیار ہے اور نوشہ میاں غائب۔ بھلا بتاؤ تو، رسمیں لڑکے کے بغیر کیسے ادا کروں۔ ایسا دولہا تو نہ سنا، نہ دیکھا۔" وہ جز بز ہوتی ہوئیں مسلسل بڑبڑا رہی تھیں جبکہ کامران نے جلدی سے نمبر ملا کے ریسیور انہیں تھما دیا۔

"ہاں...... ماں بول رہی ہوں تمہاری۔ کہاں غائب ہو؟" اس کی آواز ایئر پیس پر اُبھرتے ہی وہ تڑ تڑ نے لگیں۔ "اے میاں! یہ کہاں کی سوئی ڈاکٹری ہے، آج مہندی ہے تمہاری اور تم ہو کہ مریضوں میں الجھے ہوئے ہو۔ اے میں پوچھتی ہوں بیٹا کہ کیا پورے ہسپتال میں ایک تم ہی ہو، اور کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟ بھاڑ میں جائے سب...... اگر پندرہ منٹوں میں نہ پہنچے تو خود آ جاؤں گی ہسپتال اور وہ جوتے ماروں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گی کہ ساری ڈاکٹری واکٹری ہوا ہو جائے گی۔ فوراً پہنچو۔" وہ اس کی سنے بغیر پوری گھن گرج کے ساتھ شروع تھیں۔ بات مکمل کر کے انہوں نے ریسیور پٹخا اور باہر کی طرف چلی گئیں۔ جبکہ کامران بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے ان کے پیچھے ہی چلا گیا۔

❋

جس وقت وہ کپڑے بدل چکنے کے بعد بالوں میں برش پھیر رہا تھا، تائی امی کی ڈانٹ بھی ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اس وقت اشعر اور کامران بھی وہاں موجود تھے جو ہولے ہولے مسکرا رہے تھے۔ علی خاموشی سے ڈانٹ کھا رہا تھا۔ آخر اشعر کو اس پر ترس آ گیا۔

"آنٹی جی! اب معاف بھی کر دیں بے چارے کو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ آج شادی ہے بے چارے کی۔"

"تو سمجھا لو اس کہ اب ہسپتال اور مریضوں کو ایک مہینے کے لئے بھول جائے۔ اور اگر وہاں جانے کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ آگ لگا دوں گی ہسپتال کو۔" ان کا غصہ ٹھنڈا ہی نہ ہو رہا تھا۔

"تائی امی تو تخریب کاری پر اتر آئی ہیں۔" کامران نے اشعر کے کان میں سرگوشی کی۔

"سوری تو کر دیا ہے امی، تھوک دیں اب غصہ۔" علی نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں تائی امی! ویسے بھی آج مہندی ہے بے چارے کی۔ بخش دیں۔ ورنہ مہمانوں کے سامنے بھی منہ لٹکائے بیٹھا رہے گا۔" کامران نے سفارش کی۔

"اچھا اچھا ...... اب جلدی سے تیار ہو۔ میں لڑکیوں کو بھیجتی ہوں۔ وہی لائیں گی تمہیں باہر۔" اس بار وہ ذرا نرم لہجے میں کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"تھینکس گاڈ۔ آج تو امی جان اگلے پچھلے سارے حساب لینے پر تلی ہوئی تھیں۔" علی نے برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دعا دو ہمیں جن کی بدولت آنٹی نے بخش دیا تمہیں۔ ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ باقاعدہ جوتیوں سے پٹائی ہوتی جناب کی۔" اشعر ہنسا۔

"واقعی، تیور تو کچھ ایسے ہی تھے۔" علی مسکرایا۔

"اب چلیں بھی ...... ورنہ تائی امی باقاعدہ ڈنڈا لئے آ جائیں گی۔" کامران بولا۔

"تم دیکھو، وہ لڑکیاں آئی ہیں کہ نہیں ...... انہیں لے کر جاتا ہے نوشہ میاں کو۔" اشعر نے کہا اور کامران باہر نکل گیا۔ اشعر نے علی کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہونٹ چبا رہا تھا۔

"علی کیا ہوا؟" اشعر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا ہے یار! امی نے بہت زیادتی کی ہے۔ ہم تینوں میں سے کوئی خوش نہ رہ سکے گا۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"اب بھول جاؤ سب ...... ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم سب انسان کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں جن کی ڈور اوپر والے کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جس کے اشارے پر ہم سب ناچتے ہیں۔ ہماری قسمت ان، ان دیکھی انگلیوں کی جنبش کی محتاج ہے۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔ دیکھو آزمائش کا یہ سلسلہ کہاں جا کے رکتا ہے۔ فی الحال موڈ ٹھیک کرو۔ ان لوگوں کا سوچو جن کی خوشیاں تم سے وابستہ ہیں۔" اشعر بہت نپے تلے الفاظ میں اس کو حوصلہ دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

"ٹھیک یو یار! اگر تم نہ ہوتے تو شاید اتنی جلدی میرے لئے سنبھلنا ممکن نہ ہوتا۔" علی نے اس کے ہاتھ کو محبت سے تھام لیا۔ واقعی ایک پُر خلوص، غم گسار، مہربان دوست اللہ کا سب سے بڑا تحفہ ہوتا ہے۔ اشعر اگر اسے اس وقت سہارا نہ دیتا تو شاید واقعی ان تمام حالات کو اکیلے فیس کرنا اس کے لئے بہت کٹھن ہوتا۔ لیکن کچھ اشعر جیسے دوست کا ساتھ اور کچھ اپنے مضبوط اعصاب کی بدولت اس نے اس صورتحال کو قبول کرتے ہوئے خود پر قابو پا لیا تھا۔

پورا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ عقیل ہاؤس رنگ و بو میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہمانوں سے گھر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رنگ رنگ کی بولیوں کی آوازوں سے کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ سبھی افراد کے چہرے خوشیوں سے دمک رہے تھے اور کیوں نہ ہوتے ...... برسوں بعد تو خوشی کی محفل سجی تھی اس گھر میں۔ لڑکے لڑکیوں نے خوب رونق لگا رکھی تھی۔ زیب کی سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ سب نے مل کر خوب ہنگا..

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

برپا کیا ہوا تھا۔لڑکیوں نے اس کے سر پر زرد دوپٹہ پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنے دراز قد کی وجہ سے قدرے جھک کر چل رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کا سر دوپٹے سے ٹکرا جاتا تھا۔ سلک کا کرتہ، سفید شلوار اور کھسہ پہنے وہ راجہ اِندر بنالیوں پر یوں کے غول میں گھرا اسٹیج تک پہنچا۔ گھر کی بزرگ خواتین نے جی بھر کے اس کی نظر اتاری۔ نوجوان پارٹی نے ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ مہندی کی رسمیں ادا ہونے لگیں۔ سلمٰی چچی جو کہ اس وقت دلہن والوں کا رول ادا کر رہی تھیں، نے تیل کی پوری کٹوری علی کے سر پر انڈیل دی جبکہ کامران کسی ماہر مالشی کی طرح اس کے سر پر چمپی کرنے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے چچی جان؟'' علی اس قدر ہنگامے میں اپنی درگت بنتے دیکھ کر بوکھلا کے پاس کھڑی سلمٰی سے بولا۔

''بیٹا جی ..... شادی کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ان سب امتحانوں سے گزر کر دلہن کی سیج تک پہنچا جاتا ہے۔'' وہ شوخی سے بولیں تو وہ جھینپ کے چپ ہو گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد زرد، سادہ لباس میں ملبوس زیب کو لایا گیا۔ اس کا چہرہ لمبے سے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ علی کا دل اسے دیکھ کر سلگ اٹھا۔ زیب کو جس وقت بٹھایا گیا تب اس نے اٹھنا چاہا۔

''آپ کہاں چلے دلہا بھائی؟'' زیب کی ایک شوخ سی سہیلی نے اسے دوبارہ ہاتھ سے پکڑ کے بٹھاتے ہوئے کہا۔

''بھئی مجھے بخشیں ..... انہیں بنائیں تختۂ مشق۔ میری باری ختم ہوئی۔''

''جی نہیں ..... ابھی کہاں۔''

''پلیز امی۔'' وہ بیزار سا ہو کے ماں سے بولا اور بیٹے کا موڈ دیکھتے ہوئے تائی امی نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سب رسموں کی ادائیگی کے بعد بہت طریقے سے انہوں نے اسے اشعر کے ساتھ اندر بھیج دیا۔

آج نکاح ہونا تھا۔ دادی نے بوا کریمن کو چھوہارے لینے کے لئے کمرے میں بھیجا تو لڑکیوں نے انہیں پکڑ لیا۔

''بوا! بھائی کی شادی ہے۔ آج تو ذرا سا ڈانس کر کے دکھائیں۔'' عاصمہ نے

کہا۔

''اے ہٹو پرے ..... اب اس عمر میں ٹھمکا لگاتے اچھی لگوں گی؟'' وہ ہاتھ لہراتے ہوئے بولیں۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اتنی خوشی نہیں ہے۔'' کامران بظاہر سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''اے کیوں نہ ہو گی خوشی، میاں! میرے بچوں کی شادی ہے۔ مجھ سے زیادہ کون خوش ہو گا۔'' وہ جھٹ بولیں۔

''تو پھر آ جائیں میدان میں ..... ثبوت پیش کریں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''تو کیا تُو بھی ناچے گا؟''

''بالکل بھئی ..... میں تو بہت خوش ہوں۔ ضرور ناچوں گا۔'' وہ جوش سے بولا تو بوا کریمن کو بھی جوش آ گیا اور وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے رقص کرنے لگیں۔ سب نے نعرہ لگاتے ہوئے تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔

''اے بوا! اماں جی نے آپ کو چھوہارے لینے بھیجا تھا، آپ یہاں یہ کیا شروع ہو گئیں؟'' تائی امی کی آواز پر بوا چور سی ہو گئیں۔

''ارے بچہ! یہ ان شریروں کے کام ہیں۔ مجھے دوسری طرف لگا دیا اور میں اصل کام بھول ہی گئی۔'' بوا اتنا کہہ کر ایک کونے میں رکھا چھوہاروں کا ٹوکرا اٹھا کے باہر نکل گئیں۔

''کیا ہے امی ..... اتنا مزا آ رہا تھا۔'' زوبیہ بولی۔

''بھئی قاضی صاحب آ چکے ہیں نکاح پڑھانے۔ عرشی! تم زیب کے پاس چلی جاؤ۔ تمہاری چچی (سلمٰی) بھی ہیں اس کے پاس۔ لیکن پھر بھی چلی جاؤ۔ بچی اکیلی گھبرا نہ جائے۔ میں ذرا علی کو دیکھ لوں۔'' انہوں نے کہا اور باہر نکل گئیں۔

عرشیہ اٹھ کر زیب کے کمرے کی طرف بھاگی۔ باقی لڑکیاں بھی نکاح والے اعلان پر تتر بتر ہو گئیں۔ گھر کے چند مرد اور اس کے سب دوست اس وقت موجود تھے۔ کامران نے گلاب کے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں یہ کہہ کر ڈال دیا تھا کہ اتنے سارے لڑکوں میں دُلہا کی نشاندہی یہ پھول کرتے ہیں۔ کہیں مولانا صاحب

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نے غلطی سے کسی اور کا نکاح پڑھا دیا تو.....

جس وقت قاضی صاحب نکاح پڑھا رہے تھے اس وقت علی کے دل پر ایک چرکا سا لگا۔ اسے بالکل نہیں بھولا تھا جب کچھ عرصہ قبل ایسا ہی ایک لمحہ آیا تھا اس کی زندگی میں۔ چپ چاپ سا، نہ کوئی ہنگامہ تھا اور نہ کوئی رسم۔ تب اس نے بہت آسودگی سے "ہاں" کہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے یہ تین لفظ ادا کرنے میں کتنی دقت ہو رہی تھی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے چندن کا چہرہ آ جاتا اور وہ بے چین ہو جاتا۔

'مجھے معاف کر دینا چندن ..... میں اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔'

ہر سُو سے اٹھنے والی مبارک سلامت کی آوازیں نشتر بن کر اس کے سینے میں کھب رہی تھیں۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا ہی مقام آتا ہے کہ انسان خود سے شرمسار ہو جاتا ہے۔ قصور وار سمجھنے لگتا ہے خود کو ..... اپنے آپ کو گناہ گار تصور کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہوتا ہے، بے خطا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ اپنے فیصلے سے انحراف کرتا لیکن اسے اس حد تک مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ بے بسی کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ اس قدر خود مختار ہونے کے باوجود اسے "بے اختیار" کر دیا گیا تھا۔ صرف اس ایک لمحے نے اسے زیر کر لیا تھا اور وہ ماں کے سامنے تمام ہتھیار پھینک کر خود کو "سرنڈر" کر چکا تھا۔

❁

مووی کیمرے میں آج کی رنگین شب کے کئی حسین لمحات قید ہو چکے تھے۔ کئی بار زیب سے اس کا جسم مس ہوا، کئی بار اس کے ہاتھوں سے علی کے ہاتھ مس ہوئے لیکن علی کے دل کی دھڑکنیں منتشر نہ ہوئیں۔ اور ہوتیں بھی کیسے کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف جو ہو رہا تھا۔ محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو سب کچھ زبردستی کی بنیاد پر ہو رہا تھا۔

زیب کا مارے تھکاوٹ کے برا حال تھا۔ کئی راتوں سے اس کی نیند پوری نہ ہو رہی تھی۔ کچھ بے خوابی اور کچھ تھکاوٹ کا عالم تھا کہ جب وہ علی کے کمرے میں لائی گئی تو سیج پر بیٹھتے ہی اس نے اونگھنا شروع کر دیا۔ اس کے دل نے سب سے پہلی خواہش یہ کی کہ وہ ابھی اسی وقت بستر پر سو جائے۔ لیکن فی الحال ایسا ممکن نہ تھا،

کیونکہ ابھی لوگ کمرے میں موجود تھے۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر عرشیہ کو دیکھا جو اس کا دوپٹہ درست کر رہی تھی۔

"بہت حسین لگ رہی ہو ..... بجلیاں گراؤ گی بھائی پر۔" عرشیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ جھینپ گئی۔

"ارے وہ تو اس کے پیر دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں گے۔" زیب کی کسی رشتے دار خاتون نے اس کے نہایت حسین، گورے گورے ہاتھ پیروں کی طرف اشارہ کیا جن پر مہندی کے نہایت خوبصورت بیل بوٹے بنے تھے۔

"لیکن بھئی انہیں تو ابھی سے نیند آ رہی ہے۔" زیب کی ایک سہیلی بولی۔

"یہ نیند بھگائیے محترمہ! کسی کو بہت بری لگے گی۔" اس کی دوسری سہیلی نے کان میں سرگوشی کی لیکن یہ سرگوشی اتنی اونچی آواز میں کی گئی کہ کمرے میں بیٹھی سب خواتین سن کر ہنسنے لگیں۔ زیب نے بے بسی سے عرشیہ کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

"چلیں بھئی ..... اب سب لوگ کمرا خالی کر دیں۔ ہماری پیاری پیاری بھابی تھک گئی ہوں گی۔ انہیں کچھ دیر آرام کرنے دیں۔" عرشیہ نے سب کو بھگایا۔

"ہاں ہاں بھئی ..... کر لو آرام۔ پھر تو ساری رات بے آرامی ہی ہو گی۔" سلمٰی چچی جو ابھی ابھی اندر آئی تھیں، نے دودھ کا گلاس رکھتے ہوئے ٹکڑا لگایا تو ایک بلند مشترکہ قہقہہ کمرے میں گونجا۔

"چلو، چلو ..... بھائی کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔" عرشیہ نے سب کو باہر نکالا۔

کمرا خالی ہوتے ہی زیب نے شکر کا کلمہ پڑھا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تو بے اختیار منہ سے کراہ نکل گئی۔ کمر تختہ ہو رہی تھی۔ نیند کی تو ویسے بھی کچی تھی وہ۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ کئی راتوں کی بے آرامی اور نیند بھی حرام۔ اس نے جیسے ہی خود کو ریلیکس پایا اور مطمئن ہوئی تو فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اس کی اس بے نیازی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ علی کے لئے وہ خاص جذبہ اس کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا جو شادی کے بعد ایک لڑکی کے دل میں شوہر کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے ذہن پر تو بدلہ لینے کا بھوت سوار تھا۔ جھوٹی انا کی آگ میں اور اپنی نادانی میں وہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اپنی دنیا کو خود ہی اجاڑنے کے پروگرام بنا رہی تھی حالانکہ اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کبھی کبھی آن کی یہ آگ خود اپنے ہی دامن کو جلا دیتی ہے۔

علی نے جب کمرے میں قدم رکھا تو بے خبری سے سوئی ہوئی زیب کو دیکھ کر اس کی جان خاکستر ہو گئی۔

'ہونہہ..... مجھے شعلوں میں دھکیل کر خود چین کی نیند سو رہی ہے۔ میں نے بھی تمہاری نیندیں حرام نہ کیں تو علی نام نہیں۔' اس نے نفرت سے سوچا اور شیروانی کے بٹن کھولتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

نائٹ سوٹ پہنے جب وہ باہر نکلا تو زیب اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ علی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے اس کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچ لیا اور زیب ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ گہری نیند سے ایک دم اٹھ جانے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ لاشعوری کے عالم میں سامنے کھڑے علی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے ہی اسے کچھ یاد آیا۔ وہ گڑبڑا گئی اور پلکیں جھکاتے ہوئے دوپٹہ سنبھال کر نیچے اتر گئی۔

"اتنے ارمان سے کسی کے جذبوں کو بیروں تلے کچل کر تو تم نے اپنی سیج سجائی ہے۔ پھر اپنے شوہر کا انتظار کرنے کی بجائے سو کیوں گئیں.....؟ کیا نیند شوہر سے زیادہ پیاری ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا اور زیب کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"میں بہت تھک گئی ہوں۔" وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی۔

"اپنے اندر ہمت جمع کر لو زیب النساء بیگم! اس لئے کہ آج سے تمہارے لئے آزمائشوں کا دور شروع ہو چکا ہے۔" علی نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" زیب نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا..... پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا حافظہ کیسا ہے؟" وہ اطمینان سے بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"جی....." اس نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ یہ کیسا سوال تھا۔

"شادی سے پہلے جو وعدے میں نے تم سے کئے تھے، مجھے یاد نہیں آ رہے کہ کیا کیا وعدے کئے تھے۔ کون کون سی قسمیں کھائی تھیں۔ ذرا دہرا دو تاکہ مجھے بھی یاد

آ جائیں۔" علی طنزیہ لہجے میں بولا۔ زیب کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیا فضول باتیں کر رہے ہیں؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"اچھا..... میں فضول باتیں کر رہا ہوں۔" وہ ایک دم اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ "تو کیا تم نے امی سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں..... بولو..... جواب دو۔" وہ غصے میں بولا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ آپ کی بے کار باتیں سنتے سنتے میں بور نہیں ہونا چاہتی۔" وہ بیزاری سے بولی اور باتھ روم کی طرف مڑی تاکہ یہ بھاری لباس بدل کر ہلکا لباس پہن کر ریلیکس ہو سکے۔ لیکن علی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ انگلیاں تھیں یا لوہے کی سلاخیں..... وہ کراہ کے رہ گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے..... چھوڑیں مجھ کو۔" اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"کسی زعم میں مت رہنا زیب النساء بیگم! میں تمہاری اس عیاری کو کبھی معاف نہ کروں گا۔ تم نے اپنے لئے خود خار دار راستہ چنا ہے..... اب اس پر چلنا تمہاری سزا ہے۔" علی کاٹ دار لہجے میں بولا اور پھر ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ اپنا بازو سہلانے لگی۔

'ہونہہ..... پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں خود کو۔' اس نے سلگ کے سوچا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے تمام زیورات اتارنے لگی۔ زیورات اتارنے کے بعد وہ واش روم میں چلی گئی۔ سامنے ہی لائٹ پنک کلر کی نائٹی ٹنگی ہوئی تھی۔ اس نے بیزاری سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی شلوار قمیص نظر آ جائے۔ لیکن مایوس ہو کر اسے وہی نائٹی پہننی پڑی۔ جس وقت وہ باہر نکلی، علی بہت اطمینان سے پیر پھیلائے بستر پر دراز تھا۔

"مجھے اکیلے سونے کی عادت ہے۔" اس نے اسے دیکھے بغیر جیسے کچھ جتایا۔ وہ تلملا کے رہ گئی۔ زیب نے دانت پیستے ہوئے ایک تفصیلی نگاہ کمرے پر ڈالی۔

'کہاں سوؤں..... زمین پر.....؟ نہیں، اگر کوئی کیڑا مکوڑا نکل آیا تو؟' اور اس خیال سے ہی اس کی جان نکل گئی۔

'پھر صوفے پر.....' اس کی نگاہ صوفے پر ٹھہر گئی۔ لیکن بہت تنگ ہوں گی۔ کیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کروں؟ زمین پر سونے سے تو اچھا ہی ہے۔'

اس نے بحالت مجبوری فیصلہ کر لیا اور بیڈ کی طرف بڑھی۔ علی جو بڑی دیر سے اسے شش و پنج کے عالم میں دیکھ رہا تھا، فوراً بولا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے اکیلے سونے کی عادت ہے۔''

اس کی بات پر زیب نے سلگ کر اسے دیکھا اور بنا کچھ کہے تکیہ اور کمبل اٹھا کے صوفے تک آئی۔ علی نے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بے بی پنک کلر کی نائٹی میں ملبوس اپنے گھٹاؤں جیسے سیاہ بالوں کو سنبھالتی وہ ایمان خراب کرنے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

''مجھے روشنی میں سونے کی بالکل عادت نہیں ہے۔'' وہ پھر بولا۔

''مگر زیرو کا بلب نظر نہیں آ رہا ہے۔'' اس نے کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بالکل اندھیرے میں سونے کی عادت ہے۔''

''لیکن مجھے بالکل اندھیرے میں ڈر لگتا ہے۔'' اس نے مجبوری بتائی۔

''تو کر لو خود کو عادی۔ اب بند کرو لائٹ اور سونے دو مجھے۔ بے کار ہنگاموں میں خوامخواہ اتنی بے آرامی ہوئی ہے۔'' وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولا اور زیب کی جان اس کی بات پر جل گئی۔ وہ جلتی سلگتی لائٹ آف کر کے اندازے سے صوفے تک پہنچی اور کمبل اوڑھ کے لیٹ گئی۔ نیند تو اس ظالم نے خراب کر ہی دی تھی، اس پر ظلم یہ کہ تنگ سا صوفہ جس پر اس کو سکڑ سمٹ کر سونا پڑ رہا تھا۔ پھر کمرے میں پھیلا گھپ اندھیرا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ جانتی تھی کہ وہ کبھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ ایک بار جس بات کی ضد کر لے تو اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ یہاں تو اسے اپنا پلان ہی الٹا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ بیزار وہ علی کو کرنا چاہتی تھی لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہو رہا تھا۔

'خیر ابھی تو شروعات ہے..... گن گن کے بدلے لوں گی میں بھی۔' وہ سوچ کے مطمئن ہو گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

رات کے نجانے کس پہر اس کی آنکھ لگی تھی۔ لیکن پھر کسی کے جھنجھوڑنے پر ''

کسمسائی اور کروٹ لے کر دوبارہ سونا چاہا۔ لیکن یہ کیا ہوا؟ کروٹ لیتے ہی وہ کمبل سمیت دھڑام سے زمین پر گری۔ چوٹ لگنے سے وہ بلبلا اٹھی۔ ساری نیند اڑ چھو ہو گئی تھی۔

''ہائے اللہ، مر گئی، امی.....'' وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کراہی اور علی کا بڑا بے ساختہ قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس نے تلملا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ سفید ٹی شرٹ اور شلوار میں ملبوس گیلے بال تولیے سے رگڑتا ہوا بڑا نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔

''بند کریں ہنسنا.....'' وہ خجل ہو کر غصے میں بولی۔

''ایک بندہ جب ہنسنے کا موقع فراہم کرے تو دوسرے کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔'' وہ اسے چڑانے کو مسکرا کے بولا۔

''یہ بھی آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ صوفے پر سونے کی وجہ سے اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں بوجھل پن سا آ گیا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔

''اتنی جلدی کیوں اٹھا دیا ہے.....؟'' وہ غصے سے بولی۔

''جلدی؟..... محترمہ! صبح کے نو بج چکے ہیں اور آپ شاید بھول رہی ہیں کہ کل ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں آپ دلہن بن کے اس ہال چیز کے ساتھ رخصت کی گئی تھیں اور آج لوگ دعوتِ ولیمہ میں دلہن اور دلہا کے چہرے مبارک دیکھنے کو بے تاب ہو رہے ہوں گے۔'' علی نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''اُفوہ..... کون سی منحوس گھڑی تھی جو میں نے یہ مصیبت مول لی۔'' وہ خود کو کوسنے لگی۔

''آپ یہاں سے تشریف اٹھائیں اور بیڈ تک جانے کی زحمت کریں..... کیونکہ صبح سے دو بار سلمیٰ چچی دروازے پر دستک دے چکی ہیں اور اب میں دروازہ کھول رہا ہوں۔''

''تو کھول دیں نا..... ان لوگوں کو بھی پتہ لگنا چاہئے کہ ایک رات کی دلہن کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

''بھئی لوگوں کے سامنے تو آپ کو بھرم رکھنا ہی ہوگا۔ آخر آل ہم میاں بیوی ہیں۔ اور پھر یہ شادی سو فیصد تمہاری ہی مرضی سے ہوئی ہے اور میرے خیال میں جو کچھ ہمارے درمیان ہوگا اور ہو چکا ہے اسے تم کسی کے سامنے دہرانے کی غلطی نہیں کرو گی۔ ورنہ مجھ سے کسی قسم کے رحم کی امید نہ رکھنا۔'' وہ ایک دم ہی بہت تلخ ہو گیا تھا۔ تنبیہہ، برف کی سی ٹھنڈک، سختی، غصہ، دھمکی، نجانے کیا کیا تھا اس کے لہجے میں۔

زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کمبل اٹھایا اور نائٹی کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کا پیر نائٹی میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ لیکن اسی لمحے علی کی مضبوط بانہوں نے اسے سہارا دے دیا۔ زیب نے جلدی سے خود کو چھڑایا اور کمبل بستر پر پٹخا۔

'عجیب واہیات لباس ہے۔' وہ جھنجھلا کے سوچنے لگی اور ایک ہاتھ سے نائٹی کا گلا درست کرنے لگی جو کہ ضرورت سے زیادہ ہی بڑا تھا۔ علی جو کل تک اس کا صرف تایا زاد تھا اور جس کے سامنے کبھی اس کا دوپٹہ بھی کندھے سے نہ ڈھلکا تھا، اس وقت شوہر کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور پھر بھی وہ بنا دوپٹے کے بہت کوفت محسوس کر رہی تھی۔

وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ نہانے کی اسے عادت تھی۔ روز سویرے جب تک نہا نہ لیتی، اسے چین نہ پڑتا تھا۔ آج بھی نہانے کے بعد وہ گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتی ہوئی اسی نائٹی میں باہر نکل آئی کیونکہ فی الحال اس کے اپنے کپڑے اسی کے کمرے میں تھے۔ علی اپنی الماری کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے نائٹی پر رات والے لبادے کا بھاری کامدار دوپٹہ ہی اوڑھ لیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ علی جب مڑا تو نائٹی پر دوپٹہ دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''میرے سامنے حجاب کا ناٹک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے رہا تھا۔

زیب نے غصیلی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کا غصہ اپنے بالوں پر نکالنے لگی۔ علی نے ایک نگاہ اس کے سراپا پر ڈالی۔ نہا کے وہ اور زیادہ نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ علی نے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور بیڈ پر بیٹھ کر رسٹ واچ پہننے لگا۔

'کب تک نگاہ چراؤ گے احمد علی! مرد ہو، کبھی نہ کبھی تو باہر آؤ گے اس خول سے ..... اور تم میں تم کو دھتکاروں گی ..... اس طرح کہ تمہارا غرور مٹی میں مل جائے گا۔ بس اسی دن مجھے سکون ملے گا۔ میں دیکھتی ہوں کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے کب تک نفی کرو گے میری ذات کی۔' وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ہوئی سوچ میں گم تھی۔

''مانا کہ آپ بہت حسین ہیں۔ لیکن پلیز، ذرا اس ناچیز کو جگہ دیجئے تاکہ دراز سے اپنا والٹ نکال سکوں۔ پھر بھلے سارا دن خود کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہنے گا۔'' علی کی آواز پر وہ چونکی اور خجل سی ہو کے ایک طرف ہو گئی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو علی نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی سلمٰی چچی کھڑی تھیں۔

''کیوں بھئی ..... کمرے سے نکلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' وہ مسکراتی ہوئی اندر آئیں۔ علی اور زیب دونوں نے انہیں سلام کیا۔ کیونکہ اس گھر میں سب لوگ صبح اٹھ کر ایک دوسرے کو سلام ضرور کرتے تھے۔

''جیتے رہو۔'' سلمٰی نے دونوں کو باری باری پیار کیا۔

''اپنی لاڈلی سے پوچھیں چچی! بستر سے نکلنے کو جی نہیں کر رہا تھا ان کا۔'' علی نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔ 'عجیب شخص ہے ..... کیسی باتیں کر رہا ہے ..... چچی کیا سوچتی ہوں گی۔'

''ارے ایک ہی رات میں زیبو؟'' سلمٰی چچی نے اس کے کان میں آہستگی سے سرگوشی کی تو اس کا رنگ قندھاری انار جیسا سرخ ہو گیا۔

''نہیں چچی جان، جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا تو وہ ہنس دیں۔

''زیب! علی نے روٹھائی میں کیا دیا ہے؟'' سلمٰی چچی اس سے پوچھ رہی تھیں اور برش کرتے ہوئے ہاتھ لمحہ بھر کو رک گئے۔

'اپنے جھگڑے میں اس رسم کو پورا کرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ نہ انہیں دینے کا خیال آیا نہ مجھے لینے کا ہوش۔'

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بتاؤ ناں ..... کہاں کھو گئیں؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے علی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں دیا انہوں نے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا کہ اب تو علی کی شامت آ ہی جائے گی۔

"کیا ..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے، مذاق کر رہی ہو۔" وہ حیران رہ گئیں۔

"پوچھ لیں انہی سے۔" اس نے چڑ کر کہا تو چچی نے علی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ارے چچی جان! دراصل ان کے جلوے دیکھ دیکھ کر روشنائی کے تحفے کا خیال ہی نہیں آیا۔ میرے کوٹ کی دائیں جیب میں دیکھو۔ تمہارا تحفہ اسی میں ہے۔" علی نے بڑی خوبصورتی سے بات بناتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی زیب کو بھی بڑی لگاوٹ سے مخاطب کیا۔ سلمٰی چچی منہ دوسری طرف کر کے مسکرانے لگیں۔

"بہت کھل رہے ہو تم ..... حد میں رہو ..... چچی کے سامنے لحاظ رکھو۔" انہوں نے اس کا کان کھینچا۔

"جاؤ، خود نکال کے لاؤ۔" انہوں نے حکم صادر کیا۔ علی نے کھونٹی سے ٹنگے بلیک کلر کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مخملی ڈبیا نکالی اور زیب کی طرف بڑھا دی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ڈبیا ہاتھ سے لی اور سلمٰی چچی کی طرف دیکھا پھر ان کا اشارہ پاتے ہی ڈبیا کھولی۔ نہایت ہی حسین ہیرے کی چھ نگوں والی انگوٹھی تھی۔

"بیوٹی فل ..... مبارک ہو۔" چچی نے اسے خلوصِ دل سے مبارک باد دی۔

"تھینک یو۔"

"چلو بھئی علی! اب تم اپنے ہاتھوں سے اسے انگوٹھی پہناؤ۔" چچی نے دوسرا حکم دیا۔

"کیوں ..... کیا یہ خود نہیں پہن سکتیں؟" وہ بے مروتی سے بولا۔

"بہت بولتے ہو ..... چلو پہناؤ۔" اور علی نے بیزار سی شکل بناتے ہوئے انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں پہنائی اور پھر باہر نکل گیا۔

"چچی جان! مجھے کوئی جوڑا لا دیجئے۔ اس میں الجھن ہو رہی ہے۔" زیب نے علی

کے جانے کے بعد کہا۔

"اچھا لاتی ہوں۔ مگر یہ دوپٹہ تو اتارو۔ کس قدر عجیب لگ رہا ہے۔" انہوں نے اس کے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک اس نے اوڑھا ہوا تھا۔

جب وہ کپڑے بدل چکی تو عرشیہ اور چند دوسری کزنز اس کے کمرے میں آ گئیں۔

"کیسی گزری رات زیب؟" ایک نے شوخی سے پوچھا۔

"مت پوچھو یار ..... اتنی تھکن ہو رہی ہے۔ جی بھر کے سو بھی نہیں سکی ہوں۔ دل کر رہا ہے ابھی سو جاؤں اور خوب نیند پوری کروں۔" وہ سادگی سے بولی تو سب لڑکیاں قہقہہ لگا کے ہنس دیں۔

"کیا ہوا.....؟" زیب ان کی شکلیں دیکھنے لگی۔

"رام کہانی سنا کے پوچھتی ہے کیا ہوا۔" اس کی ایک شادی شدہ کزن ہنستی ہوئی بولی اور کمرا ایک مرتبہ پھر زنانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ زیب ان کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"بڑی خراب ہے راحت باجی۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"ہاں بھئی ..... یہ جی بھر کے سونہیں سکی ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔" کسی نے چھیڑا تو وہ روہانسی ہو گئی۔

"نجانے کیا سمجھ رہی ہیں یہ سب ..... میں تو کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔"

"چلو بھئی بچیو! بھاگو باہر۔ عرشی! تم زیب کے لئے ناشتہ لے آؤ۔" سلمٰی چچی نے مداخلت کی اور سب کو باہر نکالتے ہوئے عرشیہ سے بولیں اور پھر خود بھی باہر چل گئیں۔

"بھائی! اب ذرا ٹِک کے بیٹھیں۔ میں ناشتہ لاتی ہوں۔ کر لیں۔" وہ باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ علی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"لیکن ناشتہ تو میں کر چکا ہوں۔ دہرا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہیں ..... بھابی کے بغیر ہی کر لیا ناشتہ؟" وہ حیران ہوئی

"تو کیا پہلے میں ان کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا؟" وہ تنک کر بولا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔" وہ بزرگوں کی طرح سمجھانے لگی۔

"نانی اماں! آئندہ خیال رکھوں گا۔" علی نے اس کی ننھی سی ناک کو چٹکی میں پکڑ کے کھینچا۔

"عرشی! کیوں بحث کرتی ہو..... ؟ مجھے بھی کسی کی خاطر بھوکا رہنے کا شوق نہیں ہے..... تم لوگوں نے ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ چلو ہم سب اکٹھے ہی کر لیتے ہیں۔ وہاں زیادہ مزا آئے گا۔" اس نے لہجے کو نارمل بناتے ہوئے جتایا۔ گویا اسے بھی علی کی پرواہ نہ تھی۔

"بالکل ..... بالکل بھئی۔ اپنا گھر ہی تو ہے۔ ضرور چلو۔" علی تو جیسے تیار بیٹھا تھا، فوراً بولا۔ عرشی حیرت سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ دونوں بالکل نئے نئے بیاہتا دلہا دلہن ہیں۔

'کمال ہے ..... شادی سے پہلے والا عالم ہے۔' اس نے سوچا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے باہر آنے کی ..... کمال ہے ..... آج ان کا ولیمہ ہے، گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور یہ صاحب جائیں گی کچن میں ناشتہ کرنے۔ بیٹھو یہاں آرام سے۔ یہیں لاتی ہوں میں۔" اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی ..... وہ گلابی رنگ کے کام دار شرارہ سوٹ میں گڑیا کی طرح بنی سنوری علی کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ معمول کے مطابق ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔

'کتنا گھنا شخص ہے یہ ..... کل سے کیسے طنز کے تیر چلا چلا کے گھائل کر رہا ہے مجھے اور اب بیٹھا ہنسی مذاق کر رہا ہے۔' اس نے سوچا۔

خالہ تہذیب کو تنہا بیٹھے دیکھ کر وہ ان کے پاس چلا آیا۔

"میرا بیٹا کیسا ہے خالہ؟" اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"بالکل تیری طرح ہے ..... لیکن آنکھیں اس کی چندن کی طرح ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "بڑا ہی خوبصورت، صحت مند بچہ ہے ماشاء اللہ۔"

"آپ نے اسے کیوں نہیں روکا تھا؟"

"بہت کہا تھا رکنے کو۔ مگر نہیں مانی۔ کہنے لگی کہ نانی! میرا دانہ پانی یہاں سے اٹھ

گیا ہے۔ مجھے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ تیرے لئے بہت تڑپتی تھی وہ۔" خالہ نے عینک کے پیچھے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یاد تو وہ بھی مجھے آتی ہے۔ اسے بھولنا ممکن ہی نہیں ہے میرے لئے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"بس بیٹا! پروردگار امتحان لیتا ہے اپنے بندوں کا۔ لگتا ہے جیسے اس کے حصے کے امتحان ابھی باقی ہیں۔ کندن بن گئی تھی وہ اپنے دکھوں کی بھٹی میں۔" انہوں نے کہا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شادی کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے لیکن دعوتوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ علی اور زیب دونوں ہی دعوتوں سے تنگ آ چکے تھے لیکن انہیں اٹینڈ کرنا بھی مجبوری تھی۔ اس روز اشعر کے گھر مدعو تھے وہ دونوں۔

"شام کو تیار رہنا..... اشعر اور اس کی مسز نے انوائیٹ کیا ہے۔" صبح جانے سے پہلے وہ اسے حکم سنا گیا۔

"میں تنگ آ گئی ہوں ان دعوتوں سے۔ آپ اکیلے ہی چلے جائیے۔" وہ انکار کرتے ہوئے بولی۔

"اس نے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ ہم دونوں کو انوائیٹ کیا ہے۔" علی چبا چبا کے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہونہہ..... غلام ہوں ان کی۔ لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ نہیں جاؤں گی میں بھی۔" وہ بھی ضد میں آ گئی تھی۔

شام کو جب علی آیا تو وہ اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں؟..... جلدی کرو۔"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی۔" وہ ہنوز اسی حالت میں بیٹھی عام سے لہجے میں بولی۔

علی نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر آگے بڑھ کے رسالہ اس کے ہاتھوں سے چھین کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے اتارا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ.....؟" وہ سلگ کے بولی۔

"مجھے بات دہرانے کی عادت نہیں ہے۔ پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔" وہ خشک

لہجے میں بولا۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ نہیں جاؤں گی۔ کوئی زبردستی ہے؟" وہ غصے میں ضدی پنے سے بولی۔

"زیب النساء بیگم! اب تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔ اگر زیادہ نخرے دکھائے تو دوں گا ایک ہاتھ۔ سمجھیں؟ شرافت سے تیار ہو جاؤ۔" وہ بے حد کرخت لہجے میں بولا۔ زیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے تو کبھی کسی نے سخت لہجے میں بات بھی نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ علی نے بھی۔ لیکن اب تو وہ جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

نہایت آف موڈ کے ساتھ اس نے سیاہ رنگ کی ساڑھی نکالی جس پر نہایت خوبصورت اور نازک سا سنہری تاروں کا کام کیا گیا تھا۔ جس وقت علی پیچ کر کے آیا، زیب اپنے بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔

"یہ بلیک کلر کس کے سوگ میں پہنا ہے؟" وہ اسے جلانے کو بولا۔

"اپنے سوگ میں۔" اس نے جل کے جواب دیا۔ علی کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ تیر گئی۔

"ہونہہ..... دوسروں کو پریشان کر کے خوش ہوتے رہتے ہیں۔" اس نے لپ اسٹک کو آخری ٹچ دیتے ہوئے کہا اور اپنے سراپے پر ایک نگاہ ڈالی۔

"دوسروں کو کچھ کہنے سے پہلے ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہئے۔" وہ اس کے حسین روپ کو دیکھتا ہوا تلخی سے بولا۔

❁

"آپ نے بلایا تھا مجھے.....؟"

وہ اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ جلیل احمد اس وقت کسی فائل کی اسٹڈی میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر فائل انہوں نے بند کر کے میز پر رکھی اور اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں..... تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" علی بیٹھ گیا اور جلیل احمد پائپ سلگانے لگے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہمارا لاہور والا پروجیکٹ کمپلیٹ ہو چکا ہے۔" انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں ..... اور میں دو ایک مرتبہ وہاں کا جائزہ لینے بھی جا چکا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں ..... تو کیا دیکھا تم نے وہاں؟ کیا تمہیں سب اوکے لگا؟" انہوں نے اس کی رائے لی۔

"میرے خیال میں ابو جی ..... وہاں کچھ تبدیلیاں لانی ضروری ہیں۔"

"ہوں....." جلیل احمد نے سر ہلایا۔ "بیٹا! تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ یہ پروجیکٹ میرے برسوں پہلے کے خوابوں کی تکمیل ہے۔ میں نے بہت عرصہ پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ "الشفاء" ہسپتال کی ایک برانچ کسی اور شہر میں بھی کھولوں۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے آج میری مدد کی اور آج الشفاء کی ہی ایک شاخ لاہور میں موجود ہے۔ تم باہر سے اسپیشلائزیشن کر کے آئے ہو۔ تمہارے پاس تجربہ بھی ہے اور ذہانت بھی۔ نئی پود ہو۔ مجھ سے بہت بہتر کام کر سکتے ہو۔ اسی لئے میں تم پر ایک بھاری ذمہ داری ڈالنا چاہتا ہوں اور امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔" انہوں نے تمہید باندھی۔

"آپ حکم کریں ..... پورا کرنا اگر میرے بس میں ہوا تو انشاء اللہ ضرور کروں گا۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔

"میں یہ چاہتا ہوں بیٹا! کہ تم "الہیات" کی نگرانی کرو۔ وہ ہسپتال میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔ تمہیں اس کی ذمے داری اٹھانی ہو گی۔ میرے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینا ہو گا۔ اپنی محنت سے، اپنی جانفشانی سے، اپنی ہمت اور لگن سے، بہتر تدبیر سے نئی راہیں نکالنی ہوں گی۔" انہوں نے کہا۔

"مگر ابو! ایک دم سے اتنی بڑی ذمے داری.....؟" وہ کچھ ہچکچایا۔

"تمہیں اس کا اہل سمجھا ہے تبھی یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ مجھ اکیلے کا نہیں ہے بلکہ سرجن جمال اور سرجن آغا نے بھی تمہیں اس قابل سمجھ کر میری ہاں میں ہاں ملائی ہے۔" وہ مسکرا کے بولے۔ "تم اپنی پیکنگ شروع کر دو ..... اب تم اور زیب بیٹی

لاہور ہی میں رہو گے۔ میں نے تم لوگوں کی رہائش گاہ کا انتظام بھی کر لیا ہے۔" وہ بولے۔

"زیب بھی ساتھ جائے گی.....؟" وہ بیزاری سے بولا۔

"ظاہر ہے ..... بیوی ہے تمہاری۔ اکیلے کیسے رہو گے تم؟" وہ بولے۔

'بہت سکون سے رہتا۔' اس نے دل کے سوچا۔

"تمہاری مدد کے لئے وہاں ڈاکٹر اطہر اور ڈاکٹر فیروز موجود ہیں۔ نہایت ہی قابل اور دیانت دار ڈاکٹرز ہیں۔"

"جی ..... میں جانتا ہوں دونوں کو۔"

"اوکے بیٹا۔ وش یو بیسٹ آف لک۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ محبت پاش نظروں سے اپنے ہونہار بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"تھینک یو ابو!" وہ کھڑا ہو گیا۔

تائی امی کو پتہ چلا تو وہ رونے بیٹھ گئیں کہ اکلوتے بیٹے کو نظروں سے دور کرنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ مگر پھر جلیل احمد نے سمجھایا کہ لاہور کون سا دور ہے، ایک گھنٹے میں انسان پہنچ جاتا ہے۔ علی تو مطمئن تھا لیکن زیب کی جان پر بن آئی تھی۔

'یہاں یہ سلوک کرتے ہیں، وہاں نجانے کون کون سے ظلم ڈھائیں گے۔' وہ پیکنگ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

انہیں کل صبح روانہ ہونا تھا۔ صبح سے اب تک نجانے وہ کتنی بار رو چکی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس گھر سے، اپنے ماں باپ سے، سب اپنوں سے دور جا رہی تھی۔ پھر باپ کی بیماری کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا۔ اس پر "اس" بے دردی کے ساتھ اکیلے رہنے کا خیال ..... مارے گھبراہٹ کے اس کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ بار بار ماں سے کہتی۔

"مجھے اتنی دور نہ بھیجیں ..... مر جاؤں گی میں اکیلی۔"

سب ہی اس کی دلجوئی میں لگے تھے۔ سبھی سمجھا رہے تھے لیکن اس کا دل تو پریشان تھا۔

علی بریف کیس سامنے رکھے ضروری کاغذات کی چیکنگ میں مصروف تھا۔ وہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بے آواز رو رہی تھی لیکن اب سسکیوں پر قابو نہ رہا تھا۔ علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ سرخ کاٹن کے لباس میں سرخ چہرہ اور سوں سوں کرتی سرخ ناک سمیت بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں کہ یہ آنسو کس خوشی میں بہائے جا رہے ہیں؟" اس نے ناگواری سے پوچھا تو زیب نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"آنسو کسی خوشی میں نہیں بہائے جاتے۔" وہ تنک کر بولی۔

"اچھا تو پھر وجہ غم بتا دیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ وہ چپ رہی۔ "دیکھو! اگر میرے ساتھ نہیں جانا تو مت جاؤ۔ مگر یہ ٹسوے بہانا بند کرو۔ شدید کوفت ہوتی ہے مجھے۔ اور اگر نہیں بند کر سکتیں تو باہر چلی جاؤ۔" وہ بیزاری سے بولا اور اندر آتی ہوئی تائی امی لمحہ بھر کو ٹھٹکیں۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو علی؟ بجائے بچی کی دلجوئی کرنے کے الٹا ڈانٹ رہے ہو۔ دیکھو تو کیسی ہلکان ہو رہی ہے بچی۔" انہوں نے اسے ڈانٹا اور زیب کے پاس آ کے اسے سینے سے لگا کے پیار کرنے لگیں۔

"بالکل صحیح ڈانٹ رہا ہوں امی! فضول میں رو رو کے سر درد کھا رہی ہے۔ اگر نہیں جانا تو رہے یہیں۔ میں کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا۔" اسے بھی غصہ آ گیا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ خدانخواستہ یہاں کیوں رہے۔ سہاگن ہے ماشاء اللہ سے۔ اپنے شوہر کے ساتھ ہی رہے گی۔" انہوں نے کہا تو وہ برا سا منہ بنا کے چپ ہو گیا۔ وہ زیب کو چمکارتے ہوئے سمجھانے لگیں اور پیکنگ میں اس کا ساتھ دینے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ علی کو نصیحت بھی کرتی جا رہی تھیں۔ وہ صرف خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔

✲

صبح وہ دونوں روانگی کے لئے تیار تھے۔ زیب ایک ایک بندے سے لپٹ کر اس طرح رو رہی تھی جیسے اس کی رخصتی دو ماہ قبل نہیں بلکہ آج ہو رہی ہو۔ زیب نے ایک الوداعی نگاہ پورے گھر پر ڈالی۔ وہ گھر جہاں اس کا جنم ہوا تھا۔ جہاں وہ پلی بڑھی تھی۔ جہاں کی در و دیوار سے اس کی بہت سی خوبصورت یادیں وابستہ تھیں۔ آج اس

گھر کو چھوڑتے ہوئے اسے کتنا دکھ ہو رہا تھا یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

"بھئی آپ لوگوں کے پروگرام میں ٹائم لگتا جا رہا ہے۔ پلین ہمارے انتظار میں اپنی پرواز لیٹ نہیں کرے گا۔" علی نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔

"سنو! وہاں جا کے مجھے جلد از جلد خوشخبری سنانا۔" عرشیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیسی خوشخبری.....؟" وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"مجھے پھوپھو بننے کی بہت جلدی ہے۔" وہ شوخی سے بولی تو زیب بری طرح جھینپ گئی۔ پھر اس نے الوداعی ملاقات کے بعد ایک اور نظر عقیل ہاؤس پر ڈالی اور بوجھل دل لئے کار کی طرف بڑھ گئی۔ اشعر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ علی اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ وہ اور کامران پچھلی سیٹوں پر تھے۔ عرشیہ وغیرہ بھی ایئر پورٹ جانا چاہ رہے تھے لیکن علی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ خوامخواہ تکلیف ہو گی۔ وہ اپنے ساتھ سامان بھی بس گنا چنا ہی لے کر جا رہا تھا کہ باقی ضرورت کی ہر شے کا انتظام پہلے ہی سے وہاں ہو چکا تھا اور رہی سہی کسر زیب جا کے پوری کر سکتی تھی۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور صبح صبح کی فلائٹ۔ جس وقت وہ لوگ لاہور پہنچے تو پورا شہر شدید سردی کی لپیٹ میں تھا۔ کراچی کی اور وہاں کی سردی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کراچی کی تو سردیاں بھی بس صرف نام کی ہوتی ہیں جبکہ لاہور کی سردیاں تو جسم میں دوڑتے لہو کو منجمد کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ زیب نے نیوی بلیو کلر کا موٹی ویلوٹ کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اس نے کافی موٹا اونی سویٹر بھی پہن رکھا تھا لیکن پھر بھی اسے شدید سردی لگ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

علی نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر اپنا کوٹ اتار کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ علی نے نیچے ایک سویٹر پہن رکھا تھا اس لئے اسے اتنی سردی محسوس نہ ہوئی۔ ویسے بھی وہ بہت سخت جان تھا اور اس قسم کی سردی کو انجوائے کرتا تھا۔ زیب نے حیران سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کوٹ لے کر کندھوں پر ڈال لیا۔ علی کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی اسے مطلوبہ چہرہ نظر آیا وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

زیب نے اس کی تقلید کی۔

"ہیلو ڈاکٹر فیروز!" وہ پینتیس چالیس کے لگ بھگ ایک باوقار آدمی سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مجھے آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟" ڈاکٹر فیروز مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"بالکل نہیں۔"

"یہ یقیناً بھابی ہیں..... ایم آئی رائٹ؟" ان کی نظر زیب پر پڑی تو بولے۔

"بالکل جناب! یہ ہماری ہوم منسٹر ہیں، زیب النساء اور زیب! یہ ڈاکٹر فیروز ہیں۔ ہمارے بہت اچھے دوستوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔" علی نے بڑی خوش دلی سے تعارف کرایا۔

'کتنا بڑا ایکٹر ہے یہ شخص.....' وہ سوچ رہی تھی۔

"چلئے جناب! باقی باتیں کار میں ہوں گی۔" انہوں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ زیب پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ علی، ڈاکٹر فیروز کے ساتھ آگے ہی بیٹھ گیا تھا۔

کار شہر کے نجانے کون کون سے علاقوں سے گزر رہی تھی۔ اس کے لئے یہ شہر بالکل اجنبی تھا لیکن پھر بھی یہاں کی ہریالی اور سبزہ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ علی اور ڈاکٹر فیروز مسلسل باتوں میں لگے تھے۔ زیب کی توجہ ان کی طرف نہ تھی۔ وہ تو بس ابھی تک عقیل ہاؤس کو ہی یاد کر رہی تھی۔

'کتنے اُداس ہوں گے سب میرے بغیر۔' وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔

وہ بہت سے راستوں سے گزرتے ہوئے ایک بہت خوبصورت اور صاف ستھری کالونی میں داخل ہوئے۔

"یہ علاقہ اس شہر کا سب سے خوبصورت اور مہنگا علاقہ ہے۔ جلیل صاحب نے آپ کے لئے ایک سرپرائز رکھا ہے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے علی اور میری بہو کے لئے اس سے زیادہ خوبصورت تحفہ میرے پاس نہیں ہے دینے کو۔" ڈاکٹر فیروز نے کہا اور پھر کار ایک چھوٹے لیکن نہایت ہی شاندار بنگلے کے سامنے آ کر رک گئی۔

علی نے ڈاکٹر فیروز کی طرف دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر ہارن بجایا۔ فوراً ہی گیٹ کھلا اور ایک لمبے چوڑے پٹھان چوکیدار کی شکل نظر آئی۔ گیٹ کھولنے کے

ساتھ ہی اس نے سیلوٹ جھاڑا۔ کار اندر داخل ہوئی اور زیب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے دائیں بائیں ہرا بھرا لان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سبز مخملیں کارپٹ ہر طرف بچھا دیئے ہوں۔ ایک طرف لان میں سفید رنگ کی چند کرسیاں اور ایک میز بڑے طریقے سے رکھی تھیں۔ کیاریوں میں قطار سے لگے سرخ، نیلے، سفید، گلابی پھول سپاہیوں کی طرح سے لگ رہے تھے۔ سرو کے درخت بڑے کروفر کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کار پورچ میں رکی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ کار میں ہیٹر آن تھا اس لئے سردی کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔ لیکن باہر نکلتے ہی خوشبو دار ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کا استقبال کیا اور وہ لرز گئی۔ چوکیدار بھی بھاگتا ہوا ان کے پاس آ گیا تھا۔

"خان! یہ تمہارے صاحب اور بیگم صاحبہ ہیں۔" ڈاکٹر فیروز نے علی اور زیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"سلام صاب..... سلام بیگم صاب....." خان نے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام..... کیسے ہو میاں؟" علی نے مسکرا کے پوچھا۔

"آپ کی دعائیں ہیں صاب....." وہ انکساری سے بولا۔

"چلو یار! اندر چلیں..... یہاں سردی بہت ہے۔" انہوں نے علی سے کہا۔ "تم یہ سامان لے آؤ۔ اور ہاں، وہ بی بی کہاں ہے؟" وہ چوکیدار سے مخاطب تھے۔

"وہ اندر ہے جی..... چائے بناتا ہے۔" چوکیدار نے جواب دیا اور ڈاکٹر فیروز نے سر ہلا دیا۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ زیب بڑی تنقیدی نظروں سے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ گھر تھا تو بہت خوبصورت لیکن اس کی آرائش بس عارضی سی کی گئی تھی۔ ڈاکٹر فیروز ان دونوں کو ساتھ لئے ایک کمرے میں آ گئے جو کہ قدرے سجا ہوا تھا۔

"کہئے بھابی! کیسا لگا گھر؟" انہوں نے ہیٹر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"گھر کی ڈیکوریشن تو آپ ہی کو کرنی ہے..... ہم نے تو بس عارضی سی کر دی تھی۔ اب آپ اپنی مرضی کی آرائش کر لیجئے گا۔ میں نے ایک ملازمہ کا بندوبست کر رکھا ہے آپ کے لئے۔ کیونکہ بغیر کام کرنے والی کے آپ کا گزارا ہونا مشکل ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بی بی بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہماری دیکھی بھالی ہے۔ کشمیری ہے۔ یہاں روزگار کی تلاش میں آئی تھی۔ سمجھدار ہے۔ بس ایک دفعہ سمجھانے کی ضرورت ہو گی، سارا کام سمجھ جائے گی۔ آپ کو زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔ وہ ہر فن مولا قسم کی لڑکی ہے۔'' ڈاکٹر فیروز اسے ملازمہ کے متعلق بتانے لگے۔

''اچھا..... مگر ہے کہاں؟'' زیب نے اشتیاق سے پوچھا۔

''کچن میں چائے بنا رہی ہے۔ میں نے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی آپ دونوں آئیں وہ چائے بنا کے لے آئے۔ ابھی آتی ہو گی۔''

اور اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک اچھی خاصی صحت مند لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ زیب اسے دیکھ کر چونک گئی۔ سبز آنکھوں اور سرخ بالوں والی اس لڑکی کی عمر تو کچھ زیادہ نہیں تھی مگر اٹھان اس غضب کی تھی کہ معمولی لباس میں بھی وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے گدڑی میں لعل۔ اس شعلہ جوالا کو دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

''بی بی! تمہارے مالک آ گئے ہیں۔'' ڈاکٹر فیروز اس سے مخاطب تھی۔

''جانتی ہوں جی.....'' وہ سلام کرنے کے بعد بولی۔

زیب نے محسوس کیا کہ شکل و صورت تو اس کی بے حد خوبصورت ہے مگر آواز کافی بھاری اور کرخت ہے۔ جب وہ بات کرتی تو لگتا تھا جیسے کوئی آدمی بول رہا ہے۔ وہ سب کو چائے سرو کرنے لگی۔

''بی بی! تم دوپہر کے لئے کچھ نہ بنانا۔'' ڈاکٹر فیروز بولے۔

''کیوں صاحب؟..... پھر یہ لوگ کھائیں گے کیا؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''کھانا میں باہر سے لے آؤں گا۔''

''کیوں جی ..... باہر سے کیوں؟ مجھے آتا ہے نا کھانا پکانا۔''

''تمہارے پکائے ہوئے کھانے کے ساتھ ہاضمے کا چورن بھی کھانا پڑتا ہے۔''

''کیوں جی ..... میں اتنا برا تو نہیں پکاتی۔'' وہ برا مان گئی۔

''ہاں ..... برا تو نہیں پکاتی مگر بس گھی اور مرچوں کے ڈبے خالی کر دیتی ہو۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولے تو وہ کھسیا کے چپ ہو گئی۔

''میری مسز آج کل پیکے گئی ہیں، کوئٹہ..... ان کے بھائی صاحب کی شادی ہے۔ اگر یہاں ہوتیں تو کم از کم ایک ہفتہ تک تو آپ کو انہی کے ہاتھ کے کھانے کھانا پڑتے۔ لیکن ابھی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دونوں وقت کا کھانا میں ہوٹل سے لے آیا کروں گا۔'' وہ بڑے خلوص سے بولے۔

''بہت شکریہ فیروز صاحب ..... لیکن ہمیں باہر کے کھانے کی عادت نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ ہمیں انہی کے ہاتھ کے کھانے اچھے لگتے ہیں۔'' علی نے مسکرا کے انکار کر دیا۔

''لیکن ابھی گھر میں کتنا کام پڑا ہے۔ بھابی تھک جائیں گی۔''

''اب انہیں اکیلے ہی رہنا ہے تو تھکنے کی عادت بھی ڈالنی چاہئے۔'' علی ہلکے پھلکے انداز میں بولا تو زیب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

'کیا تھا جو مان جاتے ..... میں مشین تو نہیں ہوں کہ گھر کا بھی کروں اور کھانا بھی پکاؤں۔ پھر ابھی تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔'

ڈاکٹر فیروز نے اصرار کیا لیکن علی نے منع کر دیا

''اچھا بھئی ..... جیسے آپ کی مرضی۔ آج کے دن دونوں وقت کا کھانا میری طرف سے ہو گا اور آپ لوگ انکار نہیں کریں گے۔'' وہ بولے اور علی نے اس بار انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''کیا ضرورت تھی انکار کرنے کی ..... سچ تو کہہ رہے تھے وہ۔'' ڈاکٹر فیروز کے جاتے ہی وہ اس کی خبر لینے لگی۔

''زیب النساء بیگم! مجھے کسی کا احسان لینے کی عادت نہیں ہے۔ پھر آپ یہاں مہمان نہیں ہیں۔ یہ گھر آپ کا ہے اور یہاں کے سب کام آپ ہی کو کرنے ہیں۔ میں یہاں آپ کو آپ کے ناز نخرے اٹھانے کے لئے نہیں لایا۔ مائنڈ اٹ۔'' وہ طنزیہ لہجے میں کہتا ہوا باہر نکل گیا اور زیب کی آنکھیں بھر آئیں۔

'کیسا شقی القلب بندہ ہے۔'

❋

آج اس گھر میں اس کا دوسرا دن تھا۔ اس نے اچھی طرح سے گھوم پھر کر پورا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گھر دیکھ لیا تھا۔ گھر لگتا چھوٹا تھا لیکن اس کے باوجود ڈیزائننگ اس طرح کی گئی تھی کہ کافی بڑا لگتا تھا لیکن گنجائش بھی کافی تھی۔ علی صبح ہی ''الحیات'' جا چکا تھا۔ اس لئے وہ بے فکری سے گھوم رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کام ہی کر لیا جائے۔ سب سے پہلے اس نے بیڈ روم کی حالت ٹھیک کی۔ پھر بی بی کو ساتھ ملا کے ڈرائنگ روم کو صحیح کیا اور اتنا کرتے کرتے وہ بالکل ہی بے حال ہو گئی۔ اس نے کب اتنے بھاری بھاری کام کئے تھے۔ وہ نڈھال سی صوفے پر گر گئی۔

''بس بھئی ..... مجھ میں تو اب اور ہمت نہیں ہے۔'' وہ سر صوفے کی پشت پر ٹکاتی ہوئی بولی۔

تھکی تو بی بی بھی تھی مگر چونکہ اسے کام کرنے کی عادت تھی اور پھر وہ پہاڑی لڑکی تھی جو کہ شہری لڑکیوں کی طرح نازک نہیں ہوتیں بلکہ سخت جان ہوتی ہیں۔ اس لئے اس نے تو تھوڑا سا سستا کے اپنی تھکن اتار لی تھی مگر زیب کا دل کر رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو جائے۔ صبح سے رات ہو گئی تھی کام کرتے کرتے۔

''بیگم صاب! کھانا بھی پکانا ہے۔ صاب ابھی آتا ہی ہوگا۔'' اسے خیال آیا کہ رات کا کھانا تو ابھی تک بنایا ہی نہیں تھا۔ دوپہر کو ان دونوں نے ڈبل روٹی اور چائے کے ساتھ گزارا کر لیا تھا۔

''کیا مصیبت ہے ..... اچھا بھلا کھانا باہر سے آ جاتا۔ لیکن ان صاحب کو تو شوق ہے مجھے تنگ کرنے کا۔'' وہ جھنجلا گئی۔

''میں کھانا بنا لوں جی؟'' بی بی کو شاید اس کی تھکاوٹ کا اندازہ تھا تبھی فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''تم.....؟'' اس نے بی بی کی شکل دیکھی اور فوراً ہی ڈاکٹر فیروز کی بات اسے یاد آ گئی۔ 'علی شور مچائیں گے۔ مگر میں بہت تھک گئی ہوں۔ ایک دن سے کچھ نہیں ہوتا۔' اس نے خود ہی خود کو مطمئن کر لیا۔ ''ہاں پکا لو ..... مگر خیال رکھنا کہ مرچ اور تھی تیز نہ ہوں۔ ورنہ صاحب بہت غصہ کریں گے۔''

بی بی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سنو.....'' اسے کوئی بات یاد آ گئی۔

''جی.....؟''

''دیکھو! گھی مت ڈالنا۔ آئل استعمال کرنا۔''

''وہ کیا ہوتا ہے جی؟'' بی بی سادگی سے پوچھنے لگی۔

''تیل، کھانے کا۔'' زیب نے وضاحت کی اور وہ سر ہلاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی، ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ علی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے حلیے پر نگاہ ڈالی۔ دھول اور مٹی میں اٹی ہوئی تھی وہ۔ 'مجھے نہا لینا چاہئے۔'

وہ اٹھ کر بیڈ روم میں آ گئی جو کہ اس کا اور علی کا مشترکہ کمرا تھا۔ یہ اس کا ''عارضی ٹھکانا'' تھا۔ کل اس کو دوسرا کمرا اپنے لئے ٹھیک کر کے اس میں شفٹ ہو جانا تھا اور یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا جس پر علی نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

کپڑے اور تولیہ اٹھا کے وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ کمرے میں ہیٹر اس نے پہلے ہی کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ جیسے ہی نہا کے نکلے تو گرم کمرا مہیا ہو سکے۔

نہانے کے بعد گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹے وہ لرزتی کانپتی باہر نکلی تو علی کو سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے اسے سلام کیا اور پھر ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ پیر گرم کرنے لگی۔ علی نے شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی۔ مسٹرڈ کلر کے شلوار قمیض میں ہنا دوپٹے کے وہ سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔

''یہ کراچی نہیں، لاہور ہے ..... یہاں اس وقت نہانا تمہیں مہنگا بھی پڑ سکتا ہے۔'' وہ بیڈ پر رکھی شال اس کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔

''جانتی ہوں.....'' وہ شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔

''جب جانتی ہو تو اس وقت نہانے کا مطلب؟ بیمار پڑ گئی تو اور مصیبت۔'' وہ تنک کر بولا۔

''سارا دن کام میں گزر گیا ..... اب جا کے فرصت ملی ہے۔ میل کچیل اتارنا بھی ضروری تھا جسم سے کہ مجھے گندگی میں نیند نہیں آتی۔ اسی لئے نہائی ہوں۔ اور آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرے لئے۔ بیمار ہوئی تو خود ہی بھگتوں گی۔'' وہ بھی تیزی سے بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تو ضرورت کیا تھی اتنا سب کرنے کی.....؟" وہ اسے جلانے کو بولا۔ حالانکہ کل کی نسبت آج اسے اپنا کمرا زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

"جی ہاں..... مجھے کیا پڑی ہے..... میری بلا سے۔" وہ جل کے بولی۔

"امی اور باقی سب تمہارا پوچھ رہے تھے۔" شرٹ اتارتے ہوئے اس نے بتایا۔

"کیا..... فون آیا تھا ان کا؟ میری بات کیوں نہیں کرائی؟" وہ بے چین ہو گئی۔

"فون آیا نہیں تھا، میں نے کیا تھا ہسپتال سے۔"

"گھر سے کیوں نہیں کیا..... مجھے بھی بات کرنی تھی۔" اسے رونا آ گیا۔

"میری مرضی..... جہاں سے بھی فون کروں۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے پوچھنے کا۔" وہ غصے سے بولا۔

"بیوی ہونے کے ناتے حق پہنچتا ہے۔" اس نے یاد دہانی کرائی۔

"اچھا..... یہ اطلاع نئی ہے میرے لئے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"یہ فون ڈائریکٹ ہے؟ مجھے گھر فون کرنا ہے۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"خود ہی چیک کر لو۔" وہ دراز کھول کے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ زیب بھنا کے فون کے پاس آ گئی۔

"کوڈ کیا ہے؟" اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ایکسچینج سے پوچھ لو۔" اس نے تو قسم کھائی تھی اسے کڑھانے کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دروازہ کھلا اور بی بی اندر آ گئی۔

"کیا ہے؟" زیب کو اس کا بنا اجازت اندر آنا کھلا۔

"وہ جی..... کھانا کس وقت لگانا ہے؟" وہ گھبرا کے پوچھنے لگی۔

"بیس منٹ بعد۔"

"جی اچھا۔" بی بی پلٹنے لگی تو اس نے پکارا اور وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آئندہ کبھی بھی میرے کمرے میں آؤ تو پہلے دستک دے دیا کرو۔" اس نے تنبیہ کی اور بی بی "جی اچھا" کہتے بھاگ گئی۔ علی باتھ روم کی طرف بڑھ چکا تھا۔

زیب ایکسچینج کا نمبر ٹرائی کرنے لگی۔ خدا خدا کر کے ادھر سے فون ریسیو کیا گیا تھا اور اس نے کراچی کا کوڈ نمبر پوچھ کر گھر کا نمبر ملایا۔ لائن ملتے ہی عرشیہ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو..... کون..... عرشی! ہاں زیب بول رہا ہوں..... اچھی ہوں، تم اپنی سناؤ..... ہاں بتایا تھا انہوں نے مجھے۔ تبھی تو فون کیا ہے..... گھر؟..... بہت اچھا ہے..... تایا جان سے کہنا ان کا تحفہ واقعی بہت حسین ہے..... امی وغیرہ کہاں ہیں؟..... اچھا سلمیٰ چچی کی بھتیجی کی شادی ہے، وہاں گئی ہیں..... اچھا تائی امی سے بات کرا دو..... امی وغیرہ آئیں تو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ سب لوگ مجھے بہت یاد آتے ہیں..... بہت مس کرتی ہوں سب کو..... تم ضرور آنا میرے پاس..... اچھا کراؤ بات..... السلام علیکم تائی امی! کیسی ہیں؟..... میں بھی اچھی ہوں..... جی وہ بھی ٹھیک ہیں..... خیال..... ہاں رکھتے ہیں..... (ہر وقت طعنے بازی کرتے ہیں)..... بہت ٹھنڈ ہے تائی امی یہاں..... نہیں، رو کہاں رہی ہوں..... بس نزلہ ہو گیا ہے ناں اسی لئے آواز بھاری لگ رہی ہو گی..... جی خیال رکھوں گی اپنا..... ابو کیسے ہیں؟..... سب کو میری طرف سے پوچھئے گا..... جی..... خدا حافظ۔" اس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کئے۔

"لگا دیں میری شکایتیں....." وہ نجانے کب سے سر پر سوار تھا۔ وہ چونک گئی۔

"جی ہاں..... لگا دیں۔" وہ منہ بنا کے بولی۔

"اس کام میں تو ماہر ہیں آپ۔" وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے بولا۔

"ظفر کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام بھی آتا ہے آپ کو؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"بہت کچھ آتا ہے..... ابھی تک اندازہ نہیں ہوا ہے تم کو؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" زیب نے پوچھا۔

"میں ہوں بی بی..... کھانا لگا دیا ہے۔" وہ دروازہ کھولے بنا بولی۔

"اچھا..... آ رہے ہیں۔" زیب بولی اور شال اچھی طرح لپیٹتے ہوئے باہر نکل

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گئی۔ اسے مردہ بھی نہ بلایا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''اُف خدایا! اتنی مرچیں..... نمک تو لگتا ہے ڈالنا ہی بھول گئی۔'' اس نے فوراً گلاس منہ سے لگا لیا۔

''بی بی! تم کو منع بھی کیا تھا اتنی مرچیں نہ ڈالنا۔ اور نمک تو سرے سے غائب ہے۔ علی بہت خفا ہوں گے۔'' اسے ڈانٹنے کے ساتھ ساتھ وہ فکر مند بھی تھی کہ اب علی سے اسے باتیں سننی پڑیں گی۔

''وہ جی..... کوشش تو کی تھی۔ پر کیا کروں کہ ہاتھ ہی نہیں ٹھہرتا۔'' اس نے گھبرا کے اپنی مجبوری بتائی۔

''چاؤ یہاں سے..... کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔'' وہ جھلا کے بولی۔ مرچیں اس قدر تھیں کہ اس سے کھایا بھی نہ جا رہا تھا۔ اس نے کھانا چھوڑ دیا۔ اتنے میں علی بھی آ گیا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر سالن پلیٹ میں نکالا اور جیسے ہی نوالہ منہ میں رکھنے لگا تو زیب جو کہ اسی کو دیکھے جا رہی تھی، نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا یہ عمل بالکل بے اختیار تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' کچھ حیرت، کچھ ناگواری سے وہ اسے دیکھنے لگا۔

''یہ..... سالن مت کھائیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟..... بھوکا مارنے کا شوق چرا گیا ہے؟'' اس نے زیب کا ہاتھ جھٹک دیا اور نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ زیب تو کسی ''متوقع طوفان'' کے انتظار میں تھی۔ لیکن دوسری جانب تو عجیب سا سکوت طاری تھا۔

'ہیں..... یہ انہونی کیسی؟ ہلکی سی نمک مرچ کے تیز یا کم ہو جانے پر پورا گھر سر پر اٹھا لینے والا اتنے آرام سے اس قدر بدمزہ کھانا کھا کیسے رہا ہے؟'

اس پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ سرخ سے سرخ تر ہوتا جا رہا تھا۔

چند لقمے لے کر وہ تو چلا گیا لیکن زیب کی سوئی وہیں اٹکی تھی کہ اس نے کچھ کہا کیوں نہیں۔ اسے اس کی خاموشی سے ''خطرے کی بُو'' آنے لگی۔ جب وہ کمرے

میں آئی تو علی بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ کچھ چبا بھی رہا تھا۔ زیب نے ایک نظر اسے دیکھا اور سائیڈ ٹیبل کے پاس ٹائم پیس اٹھانے آ گئی۔

''سنو! کھانا بی بی نے بنایا تھا؟'' وہ پوچھ اس سے رہا تھا لیکن نگاہیں ہنوز کتاب پر مرکوز تھیں۔ اس کے بولنے سے زیب کو اس کے منہ سے پان کی مہک آئی۔

''پان کھا رہے ہیں آپ؟'' بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے وہ ناگواری سے پوچھنے لگی۔

''سوال کے جواب میں سوال نہیں کیا جاتا لیکن بہرحال تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

''پلیز آپ کمرے سے باہر جا کے کھائیں..... مجھ سے اس کی بدبو برداشت نہیں ہوتی۔''

''تو تم بہت شوق سے باہر جا سکتی ہو۔ لیکن پہلے میرے سوال کا جواب دو۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''جواب دینا میں بھی ضروری نہیں سمجھتی۔'' اس نے ٹائم پیس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ علی نے یکلخت اس کا بازو انتہائی سختی سے پکڑ کر کھینچا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور سیدھی اس پر آ گری۔ اس کے وجود کی مہک اور انتہائی قربت نے لمحہ بھر کو علی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

'یہ تمہاری ہے علی..... تمہارا حق ہے اس پر..... پھر کیوں یہ پابندیاں بٹھا رکھی ہیں خود پر؟'

دل کے اندر سے کسی نے بہکایا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے اندر کی آواز کو دبا لیا۔ ادھر زیب اس اچانک حادثے سے کچھ نروس سی ہو کے اس سے الگ ہوئی۔

''تم میری ہر بات کا جواب دینے کی پابند ہو، سمجھی؟ آئندہ کبھی اس طرح مجھ سے بات مت کرنا۔'' اس کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

''چھوڑیں مجھے..... بالکل جنگلی ہیں آپ۔'' اس نے خود کو آہنی پنجے سے چھڑانا چاہا مگر ناکام رہی۔ ''میں بہت تھک گئی تھی، اس لئے..... '' وہ بات نامکمل چھوڑ کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہچکیوں سے رونے لگی تو علی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ بازو ملتے ہوئے سر گھٹنوں میں دیئے وہیں بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔

"اگر شرافت سے جواب دے دیتیں تو خوامخواہ کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"کروں گی میں تائی امی سے شکایت۔" اس نے سر اٹھا کے دھمکی دی۔

"بصد شوق۔" وہ پھر مسکرایا۔

"کتنے کٹھور ہیں..... سنگدل۔"

"میرے اس روپ کی ذمہ دار بھی تم ہو۔" وہ تلخی سے بولا۔

❁

ہسپتال میں کام بہت زیادہ تھا۔ ظاہر ہے نیا نیا پروجیکٹ تھا اور پھر ساری ذمہ داری بھی علی کے کاندھوں پر تھی۔ آج کل وہ اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اپنا بھی ہوش نہ تھا، کب دن چڑھتا اور کب رات ڈھلتی اسے خبر ہی نہ ہوتی۔ صبح کا گیا رات گئے تک لوٹتا تھا۔ جس وقت گھر پر "دستیاب" ہوتا تو بھی کام ہی میں الجھا نظر آتا۔

ادھر زیب جو اتنے بھرے پرے گھر سے آئی تھی، جہاں پل بھر کو خاموشی نہ ہوتی تھی، ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی، اب اس یکسانیت سے، اس اکیلے پن سے گھبرا گئی تھی۔ گھر کی آرائش وہ کر چکی تھی اور ہر لحاظ سے مطمئن بھی ہو چکی تھی۔ کچن میں چلی جاتی۔ کچھ نہ کچھ پکانے میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی۔ پھر وہاں سے فارغ ہو جاتی اور گھڑی کی طرف دیکھتی تو جان جل جاتی کہ ابھی تو آدھا دن بھی نہیں گزرا ہوتا۔

بازار کافی دور تھے۔ بغیر گاڑی کے وہ جا نہیں سکتی تھی۔ آس پڑوس والوں کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ بڑے بڑے گھروں میں رہنے والے اِکا دُکا افراد جنہیں اپنے بازو والے گھر سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہر شخص خود میں مگن تھا۔ بی بی سارا دن اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ پھر بھی وہ اس سے کچھ نہ کچھ بات کر لیا کرتی تھی۔ لیکن کب تک اور کتنی؟..... کوئی اپنا نہ تھا کہ جس سے وہ اپنا حالِ دل کہہ، سن لیتی۔ تین دنوں سے فون بھی ڈیڈ پڑا ہوا تھا۔ ہزار بار علی سے کہا تھا مگر اس کے کان پر

جوں تک نہ رینگتی۔ ایسے میں کبھی کبھار اپنی بے پناہ مصروفیتوں سے وقت نکال کر مسز فیروز آ جاتیں تو اس کا دل بہل جاتا۔ وہ بہت ہی اچھی عادتوں اور اخلاق کی مالک تھیں۔ ہمہ وقت مسکراتا ہوا نرم چہرہ، شرارت سے بھرپور آنکھیں۔ عمر بھی کچھ اتنی زیادہ نہ تھی۔ انتیس تیس کے لگ بھگ تھیں۔ ان کے آنے سے وہ بہت خوش ہوتی تھی۔

آج کل بی بی اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اس کے ماما کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اتنے بڑے گھر میں بولائی بولائی سی رہتی۔ کھانا وغیرہ پکانے میں تو کچھ ہی دیر لگتی تھی۔ آخر دو بندوں کا کھانا ہوتا ہی کتنا ہے۔ وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی بھی تو پھر اکتا کے چھوڑ دیتی۔ علی کا ہونا نہ ہونا برابر ہی ہوتا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی اس سے بات کرتا تھا اور جو بھی کر لیتا تو طنز کے زہر میں ڈبو ڈبو کر تیروں سے سیدھا اس کی چھاتی پر وار کرتا کہ وہ بلبلا کے رہ جاتی۔

اس روز موسم بے حد خوش گوار تھا۔ وسیع آسمان پر پھیلی گھٹائیں اور ان کے پردے میں چھپا ڈھلتا سورج عجیب ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گھٹاؤں نے موتیوں کی برسات شروع کر دی۔ ننھے منے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ موسلا دھار بارش کا روپ دھار چکے تھے۔ اسے یہ موسم بہت پسند تھا۔ وہ علی کے کمرے میں آ گئی تاکہ کھڑکی سے باہر کا موسم انجوائے کر سکے۔ اس کے اپنے کمرے میں تو کوئی کھڑکی تھی ہی نہیں۔ جبکہ علی کے کمرے کی کھڑکی سیدھی لان میں کھلتی تھی۔ اس نے دریچے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور پھر پیشانی ان سے ٹکا کے باہر دیکھنے لگی۔

علی کتنا بدل گیا تھا ..... پہلے وہ اس سے کتنا ہنسی مذاق کرتا تھا، اس کو چھیڑے بغیر تو اس کا کھانا ہی ہضم نہ ہوتا تھا۔ مگر اب ..... اب تو جیسے اسے ایک ہی کام آتا تھا۔ بات بات پر اسے بے عزت کرنا، بات بات پر اسے ڈانٹ دینا، اسے دکھی کرنا، اس پر طنز کے تیر چلانا۔

'خدایا! اپنی جھوٹی انا اور غصہ میں آ کے میں نے ان کا تو کچھ نہیں بگاڑا البتہ اپنے پیر ہی زخمی کر ڈالے ہیں ..... انجانے میں یہ کیا کر بیٹھی ..... میں نے خود اپنے ہاتھوں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے اپنے لئے وہ راستہ چنا ہے جس میں سر پر کڑکتی دھوپ اور پیروں میں نوکیلے پتھر ہیں ..... میں ان سے بدلہ لینا چاہتی تھی اپنی توہین کا مگر یہاں تو الٹ ہی ہو رہا ہے سب۔ شعلوں میں تو انہوں نے مجھ کو جھلسا دیا ہے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ نیچا دکھایا ہے۔ ہمیشہ میں ان سے ہاری ہوں ..... میں نے ہر ستم کی مار برداشت کی ہے۔ مگر جب انہوں نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو میں یہ اپنی توہین سمجھ بیٹھی اور میں نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ آج وہ مجھ سے بیزار سہی مگر کم از کم میں نے انہیں اس مقام پر تو نیچا دکھا ہی دیا نا ..... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ کب تک؟ ..... آخر کب تک مجھ جیسی لڑکی کے سحر سے بچو کے علی احمد ..... ایک ہی چھت تلے اکٹھے رہ کر تم کب تک مجھ کو نظر انداز کرو گے؟ ..... اور جس دن تمہارا خول اتر گیا نا ..... بس وہی دن میری کامیابی کا دن ہو گا۔ اس دن جب میں تمہیں جھٹلاؤں گی تو تب تم کو اندازہ ہو گا کہ ''توہین'' کا احساس کیا ہوتا ہے۔''

اپنی ہی سوچوں میں غلطاں وہ اتنی دور نکل گئی تھی کہ اسے احساس ہی نہ ہوا اور علی آ گیا۔

''یہاں اکیلی کھڑی کس کا سوگ منا رہی ہو؟'' اس کی بھاری آواز پر وہ ہوش کی دنیا میں آ گئی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کے جلدی آنے پر اس کو تعجب تو ہوا مگر ظاہر نہ کیا۔

''اپنی تنہائی کا.....'' وہ جل کے بولی۔

''اچھا.....'' علی استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے اس جگہ لا کر قید کیوں کر دیا گیا ہے؟ کچھ اندازہ ہے کہ میں سارا سارا دن اکیلی پڑی رہتی ہوں یہاں۔ مجھ کو وحشت ہونے لگتی ہے اس چار دیواری سے، اس تنہائی سے۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''یہ تنہائی تو تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہے۔'' وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگا۔

''کیا، کیا ہے میں نے؟'' وہ جو کوٹ کو ہینگر میں لٹکا رہا تھا، ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑا۔ ''زیب النساء بیگم! کسی کی ساری زندگی شعلوں کی نذر کر دی اور پوچھتی ہو کہ کیا، کیا ہے تم نے ..... کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کے پوچھتی ہو کیا، کیا

ہے تم نے۔ تمہاری وجہ سے میری ماں کی نظروں میں میری حیثیت کتنی گری ہے ..... تمہاری وجہ سے میں آج تک اپنی ماں سے نگاہیں ملا کے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ تمہارے ایک جھوٹ نے میری بنیاد ہلا کے رکھ دی ہے۔ کسی کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ کسی کو ایک بار پھر اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے مجبور کر دیا ہے اور تم پوچھتی ہو کہ تم نے کیا، کیا ہے۔ تم نے کتنے سارے قصور کئے ہیں اور پھر بھی خود کو بے قصور سمجھتی ہو۔'' وہ تو جیسے پھٹ پڑا تھا۔ اس کے لہجے میں کیسی غرابت تھی اور آنکھوں سے کیسے شعلے نکل رہے تھے وہ کانپ گئی۔ ''بہت ظالم ہو تم ..... بہت ظلم کئے ہیں تم نے ..... اسی وقت انکار کر دیتیں تو شاید آج یہ سب نہ ہوتا۔'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولا۔ ''جاؤ ..... چلی جاؤ یہاں سے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''علی! مجھے لگتا ہے کہ جیسے کوئی ہم دونوں کے درمیان ہے ..... بتائیں کون ہے وہ، جس کی وجہ سے آپ مجھ سے اتنے بدظن ہیں؟''

وہ چلّا کے پوچھ رہی تھی۔ علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ (اسے کیونکر شک گزرا لیکن علی نہیں جانتا تھا کہ عورت کی چھٹی حس اپنے شوہر کے معاملے میں کتنی تیز ہوتی ہے۔ صرف آج ہی نہیں، پہلے بھی کئی دفعہ اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ علی اور اس کے درمیان کوئی ''تیسرا'' ضرور ہے۔ لیکن کون ..... اس سے وہ بے خبر تھی۔

''فضول باتوں کا جواب نہیں ہے میرے پاس ..... گیٹ آؤٹ!'' وہ طیش میں آ کے بولا۔ لیکن وہ بضد رہی۔

''دیکھو زیب! اپنی حد میں رہو ..... یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔'' وہ درشتی سے بولا۔

''حد جانتی ہوں میں اپنی ..... اسی لئے پوچھ رہی ہوں کہ کون ہے وہ ڈائن، وہ چڑیل جس پر آپ میرا حق استعمال کر چکے ہیں؟'' وہ اس کے بازو پکڑ کے جھنجھوڑتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

علی کی برداشت سے باہر ہوا تو اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ وہ الٹ کر قالین پر جا پڑی۔

''مجھ پر ہاتھ اٹھایا آپ نے.....؟'' گال پر ہاتھ رکھے وہ سکتے کے عالم میں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ، جسے کبھی اس کے والدین نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا، آج علی کا بھرپور تھپڑ کھانے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اٹھے تھے۔ ہاتھ کسی عورت کا نہیں بلکہ ایک بھرپور جوان مرد کا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ سے سرخ سرخ لہو کی لکیر سی بہہ نکلی۔

''تمہاری گھٹیا بات کا اس سے اچھا جواب نہ تھا میرے پاس۔'' وہ بنا کسی ندامت کے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ کبھی نہیں۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ساری رات اس نے رو رو کے کاٹی۔ کب رات ڈھلی اور کب صبح ہوئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔ صبح جب علی ناشتے کے لئے باہر آیا تو ڈائننگ ٹیبل خالی تھی۔ وہ کچن میں گیا تو وہاں بھی ویرانی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ ادھر کا موسم ابھی تک ابر آلود ہے۔

'ہونہہ..... نواب زادی اب نخرے دکھائیں گی۔'

وہ بڑے خراب موڈ میں اس کے کمرے تک آیا۔ ہینڈل دبایا تو دروازہ کھل گیا۔ وہ بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ علی اس کے پاس آ گیا۔ جب اس کے چہرے پر نگاہ ٹھہری تو وہ چونکا۔ چہرے پر آنسوؤں کے نشان اور پھٹے ہوئے ہونٹ کو دیکھ کر اسے احساسِ ندامت نے آ گھیرا۔

'مجھے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔' اس نے سوچا۔

اس کا دل تو بہت حساس تھا۔ بہت پیار کرنے والا انسان تھا وہ..... لیکن زیب سے اسے اس قدر چڑ ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی وہ اس سے ضرورت سے زیادہ ہی زیادتی کر جاتا تھا جس کا احساس اسے بعد میں ضرور ہوتا تھا۔ اس نے ہولے سے اسے پکارا تو ایک دم سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے ہی علی پر نگاہ پڑی تو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری!'' وہ صرف اتنا کہہ کر باہر نکل آیا۔ جب کہ زیب اپنی سوجی ہوئی آنکھوں میں حیرت اور شکوہ لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔

'کتنے آرام سے سوری کہہ کر چلے گئے..... نہ حال پوچھا نہ پوچھا۔' اس نے دکھ

سے سوچا۔ وہ بنا ناشتہ کئے ہی جا چکا تھا۔

اگلی صبح وہ احتیاجاً کچن میں نہ گئی۔ علی نے ناشتہ مانگا تو تنک کر جواب ملا۔

''میں نہیں بنا سکتی..... بھوک لگی ہے تو خود بنا لیں۔''

''کیوں..... تمہارے ہاتھوں میں کیا تکلیف ہے؟'' علی نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

''میں آپ کی نوکرانی نہیں ہوں۔'' وہ بغیر ڈرے بولی۔

''آج تو مزاج کچھ زیادہ ہی برہم لگ رہے ہیں۔''

''مجھے کراچی جانا ہے۔ آج ہی..... ایک دن نہیں ٹھہر سکتی میں اس ٹارچر سیل میں مزید۔ مجھے ٹکٹ لا دیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''واپسی کا خیال تو بھول جاؤ زیب النساء بیگم..... اب تو تم کو تاحیات اسی ٹارچر سیل میں رہنا ہوگا۔'' وہ برف کی طرح سرد اور چٹانوں جیسے سخت لہجے میں بولا۔

''کبھی نہیں..... ہرگز نہیں..... ایک دن مزید نہیں رکوں گی میں یہاں..... آپ نے مجھے یہاں ایسے رکھا ہے جیسے کوئی اپنے نوکروں کو بھی نہیں رکھتا۔'' وہ رو پڑی۔

''اگر تم نے اس دلیز کو پار کیا تو ساری عمر واپسی کو ترسو گی۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''ہونہہ..... صرف ایک ہی ہتھکنڈا استعمال کرنا آتا ہے مردوں کو۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''اسے محض دھمکی مت سمجھنا..... اس لئے کہ میں جو بات کہہ دیتا ہوں اسے عملاً کر کے بھی دکھاتا ہوں۔ یہ گیدڑ بھبکیاں نہیں ہیں۔'' وہ سفاکانہ انداز میں بولا۔

''میں پاگل ہو جاؤں گی یہاں۔'' وہ چیخ پڑی۔

''یہ آنسو، یہ تنہائی تم نے خود ہی اپنی تقدیر میں لکھی ہے۔'' وہ بے رحمی سے بولا۔ 'اس پتھر کے سامنے رونا بالکل بیکار ہے۔ اس کے ساتھ رہنا ہے تو ایسا ہی بننا پڑے گا۔' اس نے اپنے آنسو صاف کئے اور کچن میں آ کر ناشتہ بنانے لگی۔

❋

خدا خدا کر کے فون ٹھیک ہوا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عقیل ہاؤس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

فون کیا۔فون عرشیہ ہی نے اٹینڈ کیا تھا۔اس کی آواز سن کر وہ کھل اٹھی۔

''تم بھی کوئی بھولنے والی چیز ہو ..... دراصل فون خراب تھا۔ آج ہی ٹھیک ہوا ہے تو سب سے پہلے تم کو فون کیا ہے ..... کیسی ہو تم اور باقی سب؟..... ابو کی طبیعت کیسی ہے ..... اچھا ..... پہلے سے کچھ بہتر ہیں ..... وہ بہت بزی ہوتے ہیں ..... میں ..... سارا دن اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں ..... اچھا ..... کیا ہے بوریت کا علاج؟..... کیا بڑا شوق ہے تمہیں پھپھو بننے کا؟''

اس کی کھلکھلاتی آواز پر علی ذرا سا چونکا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں بیٹھی دوسرے فون سے باتیں کر رہی تھی جبکہ علی اپنے کمرے میں تھا اور اس کا کمرا لاؤنج کے بالکل ساتھ ہی تھا۔

''اچھا ..... کیا کہہ رہی تھیں امی اور تائی امی ..... کیا ..... ارے بھئی ضروری تو نہیں کہ اتنے جلدی بچے بھی ہو جائیں ..... لوگوں کے تو شادی کے دس دس سال بعد بھی ہوتے ہیں اور ہماری شادی کو تو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا ..... ان سے کہو فکر نہ کریں ..... یوں بھی اس معاملے میں مکمل اختیار تمہارے بھائی کو ہے ..... مجھے.....'' وہ زور سے ہنس پڑی۔''بھئی تم کو تو پتہ ہے بچے مجھے کتنے پسند ہیں ..... کروایا تھا میں نے چیک اپ ..... بالکل ٹھیک ہوں میں.....'' اس نے جھوٹ بولا۔

''کیا ..... انہیں میں کیسے کہوں ..... امی وغیرہ ہی کہہ سکتی ہیں ان سے ایسی بات۔''

اور علی لمحہ بھر میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کی مردانگی کے منہ پر جیسے کس کے کسی نے طمانچہ مار دیا ہو ..... برداشت کی حدیں ختم ہونے کو تھیں۔ وہ باہر آ گیا۔ اس نے زیب کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ بھونچکی سی اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' وہ سنبھلتی ہوئی غصے سے بولی۔

''تم ..... تم ..... اس قدر فضول لڑکی ہو ..... کتنی بے حیائی سے ایسی باتیں کر رہی تھیں ..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس قسم کی گفتگو میری بہن سے کرنے کی۔ کس قدر بے لگام ہے تمہاری زبان۔'' وہ لال بھبھوکا چہرہ لئے پوچھ رہا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، بی بی نے آ کے مسز فیروز کے آنے

کی اطلاع دی۔

''انہیں یہیں لے آؤ۔'' بوکھلا کر زیب نے کہا اور علی اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زیب نے بھی خود پر قابو پا لیا۔ اسی وقت مسز فیروز آتی ہوئی دکھائی دیں۔

''السلام علیکم مسز فیروز!'' وہ بڑی خوش دلی سے ان سے ملی۔

''وعلیکم السلام ..... تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا ہے اس وقت آ کے؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔

''ارے بالکل بھی نہیں ..... ویسے بھی سارا وقت اکیلی ہوتی ہوں ..... میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی ہو جو مجھے ڈسٹرب کرے۔'' وہ مسکرا کے بولی

''تو پھر پیدا کر لو نا، دو چار ڈسٹرب کرنے والے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولیں تو زیب جھینپ گئی۔

''چھوڑیں بھی ..... کیا بات لے بیٹھیں۔'' وہ بولی۔

''نہیں واقعی، تمہاری شادی کو اگلے ماہ سال پورا ہو جائے گا۔ اور تم ہو کہ کوئی ''خاص تبدیلی'' ہی نظر نہیں آ رہی ہے تم میں ..... اتنی بے پرواہی اچھی نہیں ہوتی میری جان! اپنا چیک اپ ضرور کرا لینا۔ بلکہ ایسا کرنا کہ میرے ساتھ چلنا۔ میں اپنی فیملی ڈاکٹر سے تمہارا چیک اپ کرا لوں گی۔ بہت اچھی ہیں۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھیں اور زیب کو گھبراہٹ ہونے لگی کہ علی کا موڈ پہلے ہی خراب تھا۔ اس پر جو اگر اس نے یہ باتیں سن لیں تو کوئی بعید نہ تھا کہ دوبارہ ہی ایک ہاتھ نہ جڑ دے۔ ہاتھ بھی تو ہتھوڑے کے برابر تھا۔

''جی، جی ..... ضرور۔'' وہ ٹالنے والے انداز میں بولی۔''میں آپ کے لئے ٹھنڈا لاتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک دیا۔

''نہیں ..... بیٹھو تم ..... میں تو صرف یہ کارڈ دینے آئی تھی۔'' انہوں نے پرس سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''کیسا کارڈ؟'' وہ دیکھنے لگی۔

''میری بیٹی کی منگنی ہے اگلے ہفتے۔ تم اور علی دونوں انوائٹ ہو۔ علی کو تو فیروز

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خودی انوائٹ کر دیں گے لیکن تم تو میری اسپیشل گیسٹ ہو اس لئے میں خود تمہیں کہنے چلی آئی۔

"اچھا ...... بہت بہت مبارک ہو آپ کو ...... ہم ضرور آئیں گے۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"اچھا تو پھر میں چلتی ہوں ...... اور ہاں، تھوڑے دن بعد تم کو لے جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس۔" وہ جاتے جاتے بولیں اور زیب انہیں چھوڑنے گیٹ تک چلی گئی۔

"بی بی! صاحب کو دودھ دے آئیں؟" وہ کچن میں آٹا گوندھتی بی بی سے پوچھنے لگی۔

"نہیں جی ...... آج آپ دے آؤ ...... میرے ہاتھ تو گندے ہو رہے ہیں۔" اس نے اپنے آٹا لگے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ گھبرائی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ایزی چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک میں ایئر فریشنر کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کمرے کی ساری بتیاں گل تھیں۔ صرف سائیڈ لیمپس کی ٹھنڈی روشنی کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔ زیب نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ سفید کرتے میں سے جھانکتے سیاہ بال، گہری سیاہ آنکھوں میں لال لال ڈورے، بکھرے بکھرے سے سر کے بالوں سے کشادہ پیشانی آدھی چھپی ہوئی۔ وہ بالکل یونانی دیوتا لگ رہا۔ اس کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ پلٹنے لگی تو اس کی بھاری آواز نے کمرے کی خاموشی توڑی۔

"ٹھہرو......" وہ ٹھٹک کے اسے دیکھنے لگی۔ "اب بتاؤ کہ تم نے عرشیہ سے ایسی بات کیوں کی تھی؟" وہ بھاری آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے ...... سہیلی ہے وہ میری اور دوستوں میں تو ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ نے تو چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔

"تم نے صرف بات نہیں کی ہے زیب النساء بیگم ...... بلکہ میری مردانگی کو نشانہ بنایا ہے۔ پہلے میری ماں کی نظروں میں مجھے ذلیل کیا اور اب بہن کے سامنے بے مول کرنا چاہتی ہو۔" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

"فضول غصہ کر رہے ہیں۔ میں خدانخواستہ کیوں ذلیل کرنے لگی آپ کو؟" وہ نرمی سے بولی کہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔

"تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جو کچھ میرے کانوں نے سنا وہ غلط تھا۔" وہ تنک کے بولا۔

"پتہ نہیں آپ نے کیا سنا اور کیا نہیں ...... لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں مجھے بے عزت کرنے کا۔" وہ اس بار چڑ کے بولی۔

"تم خود کو معصوم ثابت کرنا چاہتی ہو ...... میرے گھر والوں کی نظروں میں مجھے گرانا چاہتی ہو۔ اپنے لئے ہمدردیاں سمیٹنا چاہتی ہو ...... سب سمجھتا ہوں تمہارے حربے ...... بہت شاطر ہو تم ...... لیکن ایک بات میری بھی سن لو۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے تمہیں تمہارے حق کے لئے ترساتا رہوں گا ساری عمر۔" اس کی زبان آگ برسا رہی تھی۔

"بس کریں ...... کیا سمجھتے ہیں خود کو ...... بہت اعلیٰ و ارفع شے ...... شقی ہیں آپ ...... پتھر، خود غرض اور انا پرست ...... آپ سمجھتے ہیں کہ عزت صرف آپ ہی کی میراث ہے۔ میری عزت نفس کچھ نہیں ہے ...... جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، ایک لمحہ سکون سے نہیں جینے دیا آپ نے مجھے ...... ہر لمحہ ذلیل کرتے ہیں۔ پل پل میری عزت نفس کو مجروح کرتے ہیں۔ میں بھی جیتی جاگتی لڑکی ہوں۔ مجھے بھی چوٹ لگتی ہے۔ درد ہوتا ہے۔ اور جب میں چلانا چاہوں تو آپ کہتے ہیں کہ اپنا منہ بند رکھوں ...... یہاں لا کے قیدی بنا کے رکھ دیا ہے مجھے ...... نہ کہیں آ سکتی ہوں نہ جا سکتی ہوں، نہ ہی کسی سے بات کر سکتی ہوں۔ اگر عرشی سے فون پہ حالِ دل کہہ سن لیا تو کیا جرم کیا ...... میں بھی تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ ظالم ہیں۔ مجھے میرے حق سے محروم رکھا ہوا ہے ...... کیا وجہ ہے اس کی؟ کیا میں بدصورت ہوں؟ اندھی، بہری، لنگڑی ہوں؟ ...... کون سی کمی ہے مجھ میں جو آپ مجھے اس بری طرح نظر انداز کرتے رہتے ہیں ...... میری توہین کرتے ہیں ...... آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے قرب کے لئے تڑپ رہی ہوں تو نکال دیجئے اس خیال کو دل سے ...... آپ مجھے کیا محروم کریں گے میرے حق سے۔ میں خود محروم کرتی ہوں آپ کو اس حق سے۔ آپ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہتے ہیں، میں نے کیوں عرشیہ سے اس قسم کی بات کی تو پھر جواب دیں مجھے کہ کیوں ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود اتنے فاصلے ہیں ہم میں؟..... آپ مجھ سے یوں کتراتے ہیں جیسے میں آپ کی بیوی نہ ہوں، ہمارے درمیان کوئی تعلق ہی نہ ہو..... تو میں یہی کہوں گی کہ اس کی وجہ وہی ''تیسرا'' وجود ہے جس کے ہونے کا مجھے یقین ہے۔ جس پر آپ میرے حقوق استعمال کر چکے ہیں۔ آپ کا مطلب اس ''دوسری عورت'' پر نکل چکا ہے۔ یہی وجہ ہے آپ کے رویے کی۔ لیکن میری بھی بات سن لیں کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں آپ کو ہمیشہ خود سے دور رکھوں گی۔ اگر آپ چاہیں گے، تب بھی۔''

وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔ بنا لحاظ کے اگلی پچھلی سب کسر نکالنے پر مصر تھی۔ غم و غصے کی شدت سے اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہتی جا رہی ہے۔ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ آج علی نے اس کے لئے بہت غلط قسم کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اس کے نفس کو کمزور سمجھا تھا۔

''چناخ..... چناخ.....''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دو زناٹے دار تھپڑ اس کے پھول ایسے گالوں پر پڑے اور وہ لڑکھڑا کے رہ گئی۔

''بس ..... بہت ہو چکا ..... تمہارے جملے تازیانے کی طرح لگے ہیں میری مردانگی پر..... کیا سمجھتی ہو تم کہ میں اتنا بے اختیار ہوں..... اتنا بے بس ہوں..... تو سن لو زیب النساء بیگم! مرد کبھی کمزور نہیں ہوتا، بے اختیار نہیں ہوتا۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ لمحوں کی گرفت مجھ پر حاوی ہو جائے۔ تم کیا چیز ہو؟ کس بات کا فخر ہے تم کو..... اپنے رنگ روپ پر ناز کرتی ہو جو کہ دو دن کی چاندنی ہوتا ہے۔ اتنا زعم ہے تم کو خود پر..... میں..... علی احمد جس نے کبھی خود پر کسی کو حاوی نہیں ہونے دیا..... میں وہ ہوں جس نے ان لمحوں کو بھی اپنی مٹھی میں قید کیا تھا جو لمحے دوسرے مردوں کے قدم ڈگمگانے کا سبب بن سکتے ہیں۔ کتنی دور ہو تم میری دسترس سے۔ ہاں..... بولو! کیا سمجھتی ہو، میں اتنا کمزور ہوں جو صورتوں پر دیوانہ ہو جاتا ہوں..... تمہیں کہا تھا نا کہ کبھی چیلنج مت دینا مجھے..... جانتی ہو کہ مرد کی مردانگی کو اگر نشانہ

بنایا جائے تو کیا ہوتا ہے.....؟ اب بتاؤں گا میں تمہیں۔ وہ حشر کروں گا تمہارا کہ پناہ مانگو گی مجھ سے۔''

اس کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ تھی اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک پاگل پن سا طاری ہو گیا تھا اس پر..... قتل عمد تک کے جذبات کو پہنچ چکا تھا وہ..... احساسِ توہین اور غصے نے اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ زیب نے بہت چاہا کہ اس کی گرفت سے نکلے لیکن اس کی گرفت آہنی تھی..... وہ تڑپ کے رہ گئی.....!

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ بستر سے اٹھ گیا۔ زیب کی سسکیوں کی گونج پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ روتے روتے بالکل نڈھال ہو چکی تھی وہ۔

''اب کیوں رو رہی ہو.....؟ اب تو ہر شکایت دور ہو جانی چاہئے تمہاری۔ عرشیہ کی پھوپھو بننے کی آرزو جلد ہی پوری ہو جائے گی۔''

وہ دل جلانے والی مسکان کے ساتھ کہتے کہتے واش روم میں گھس گیا اور زیب نے تکیے میں منہ چھپا کر ہچکیاں لینی شروع کر دیں۔

✲

عرشیہ کی منگنی کی تاریخ فکس ہو گئی تھی۔ زیب اور علی دونوں کے لئے ہی خوشی کی خبر تھی۔ تائی امی نے دونوں کو دس بارہ دن پہلے سے آنے کا کہا تھا۔

''تم چلی جانا..... میں منگنی سے ایک دو دن پہلے آ جاؤں گا۔'' اس نے کام کی زیادتی کی بناء پر اس سے کہا اور وہ تو ان دنوں کو ''ایامِ نجات'' سمجھ کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

جس دن اس نے عقیل ہاؤس میں قدم رکھا تھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے وہ جنت میں آ گئی ہو۔ سب سے مل کر، سب کے درمیان کتنی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ خالدہ کے تو گلے سے لگ کے وہ بے اختیار زور زور سے رونے لگی تھی جس پر کامران نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔ تائی امی، علی کے نہ آنے پر سخت جز بز ہو رہی تھیں۔

''یہ تجھے کیا ہوا ہے..... کتنی کمزور ہو رہی ہو۔'' عرشیہ اسے دیکھتے ہی بولی تھی اور اس نے بہانہ بنا کے ٹال دیا تھا۔ اب کیا بتاتی کہ تمہارے بھائی نے تو زر خرید

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لونڈیوں جیسا سلوک روا رکھا ہے مجھ سے۔

پتہ ہی نہ چلا اور ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس رات وہ لیٹی تو نجانے کیوں بار بار دھیان علی کی طرف چلا جاتا۔ نجانے کیا کر رہے ہوں گے؟..... بی بی کے ہاتھ کا پکا کھانا تو پسند نہیں ہے۔ جتنے دنوں کا میں نے پکا کے فریزر میں رکھ چھوڑا تھا وہ تو ختم ہو گیا ہوگا..... شاید باہر سے کھاتے ہوں..... پتہ نہیں مجھے یاد کرتے ہوں گے کہ نہیں۔ نہیں کرتے ہوں گے۔ شکر کیا ہوگا کہ چلی گئی۔ لیکن فون کر کے دیکھوں تو سہی..... اس نے سوچا۔ دل نجانے کیوں ایسی پاگل پاگل سی آرزو کر رہا تھا۔

وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔ عرشیہ وغیرہ اس وقت اپنے اپنے کمرے میں تھے۔ خالدہ اور خلیل احمد بھی سو چکے تھے۔ وہ گھڑی پر وقت دیکھتی ہوئی نمبر ملانے لگی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد بی بی کی آواز فون پر اُبھری۔

'ہیں..... یہ ساڑھے بارہ بجے گھر میں کیا کر رہی ہے؟ اس وقت تو اس کے فرشتے بھی سو چکے ہوتے ہیں۔' اس کے دل میں شک اُبھرا۔

''بی بی! تم اس وقت..... اپنے کوارٹر کیوں نہیں گئیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''وہ جی صاحب کے لئے کھانا لائی ہوں۔'' وہ سادگی سے کہنے لگی۔

''اس وقت.....؟'' شک کا ناگ پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

''جی ہاں..... صاحب ابھی ابھی تو آئے ہیں۔'' وہ بتانے لگی۔

''اچھا تم نے کون سے والا فون اٹھایا ہے؟''

''صاحب جی کے کمرے والا۔'' اس نے جواب دیا اور زیب کی ساری نیند ہوا ہو گئی۔

''صاحب کہاں ہیں؟'' اس بار اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ بی بی گھبرا ہی گئی۔ اس نے فائلوں میں الجھے علی کو دیکھا جس کے کان اسی طرف لگے تھے۔

''جی..... وہ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔'' وہ بولی۔

اسی وقت علی نے آگے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے جانے کا اشارہ

کر دیا۔ اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔ زیب کہہ رہی تھی۔

''سنو! جب تک میں نہیں آ جاتی، صاحب کے کمرے میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رات کے کھانے کی ڈیوٹی خان کے سپرد کر دو۔ کہنا کہ یہ میرا حکم ہے۔ سمجھ گئی؟ اب دو فون صاحب کو۔'' وہ بی بی کے بے پناہ حُسن سے یکدم ہی ڈر گئی تھی۔ مرد کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی کمزور پڑ ہی جاتا ہے اور اس کا سبب بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ عورت کو تسخیر کرنے کا فن آتا ہے۔

''زیب النساء بیگم! آپ کے زریں خیالات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اور اس بات پر حیرت بالکل بھی نہیں ہوئی۔ آپ کا، ہمارا بچپن کا ساتھ ہے اور آپ پھر بھی ہم پر شک کر رہی ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا کہ اپنے متعلق زیب کی یہ بے اعتباری اچھی نہ لگی تھی۔

اس کی آواز سن کر وہ گڑبڑا گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔

''کچھ غلط بھی نہیں کہا ہے میں نے۔ مرد ذات کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔''

''اچھا..... تو اپنی صنف کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے سابقہ لہجے میں کہا۔

''عورت فریب حُسن میں نہیں آتی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''تو یہ بھی سن لو کہ ''سب'' مرد بھی فریب حُسن میں نہیں آتے۔'' وہ چبا چبا کے بولا۔ ''اب بولو..... فون کیوں کیا تھا؟ یقیناً اسی شک کے ہاتھوں بے چین ہو کے کیا ہوگا۔'' اس نے خود ہی سوال کر کے جواب بھی خود ہی دے دیا۔

''دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔'' اس نے خفا خفا سے لہجے میں کہا۔

''اچھا.....'' علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اور سن لیں۔ خبردار جو آئندہ اتنی دیر تک بی بی کو گھر میں رکھا۔'' اس نے خالص بیویوں والے انداز میں اسے دھمکاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ علی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

کتنے دن ہو چکے تھے اسے علی ہاؤس آئے ہوئے..... اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ اسے ''اپنا'' گھر بہت یاد آ رہا تھا۔ وہی گھر جہاں وہ رہتی تھی تو وہاں کی تنہائی،

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہاں کا سناٹا اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا اور وہ وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ علی کی قربت، اس کی محبت سے وہ کتنا گھبراتی تھی۔ لیکن اب جبکہ وہ یہاں آ چکی تھی، اپنے پیاروں کے درمیان تو اسے وہی گھر بہت یاد آنے لگا تھا۔ شروع کے دنوں میں تو اسے اتنا محسوس نہ ہوا لیکن اب اس کا جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر اسی ''نارچرسیل'' میں چلی جائے جہاں سے نکلنے کو وہ دن رات تڑپتی تھی۔ نجانے کیوں اس کے ایسے احساسات ہو رہے تھے۔

بہت دنوں کے بعد موسم اس قدر خوش گوار ہوا تھا۔ سرمئی اور سیاہ اٹکھیلیاں کرتی بدلیاں کھلے آسمان پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی پھر رہی تھیں۔ ہوا کے شوخ جھونکے جب پھولوں کا بدن چھو کے گزرتے تو فضا مہک مہک جاتی۔ عقیل ہاؤس کے سرسبز لان میں مختلف قسم کے پھول پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ پھول ایسے تھے کہ جنہیں علی نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اسے یاد تھا کہ علی کو بھی اسی کی طرح پھولوں سے، رنگوں سے، پرندوں سے، موسموں سے کس قدر پیار تھا۔ بچپن میں وہ حسب عادت جب کوئی پرندہ، کوئی طوطا، کوئی رنگین پروں والی چڑیا بازار سے خرید کے لاتی تو علی ان پرندوں کے پنجرے کھول کر انہیں اُڑا دیتا تھا۔ وہ روتی، چلاتی تائی امی کے پاس شکایت کرنے پہنچ جاتی۔ جب تائی امی علی کی خبر لیتیں تو وہ بڑی سادگی سے جواب دیتا۔

''امی جان! مجھے پرندے اُڑتے ہوئے آسمانوں پر اچھے لگتے ہیں اور یہ زیب کی بچی ان معصوموں کو قید کر کے خوش ہوتی ہے۔''

یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے پنجرے میں بند پرندے اچھے لگتے تھے۔ پھر انتقاماً وہ علی کے پھول پودے خراب کر دیتی جو کہ وہ بڑی محنت سے لگاتا تھا کہ اس طرح سے اپنا انتقام لے کر وہ خوش ہو جاتی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ ہوتا یہ کہ جب کبھی زیب کے لئے خلیل احمد کوئی پنجرے میں بند پرندہ لاتے تو وہ اسے اُڑا دیتی اور کہتی۔

''واقعی! پرندے تو کھلے آسمان پر اُڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔''

اس کے بال شولڈر کٹ تھے مگر پھر ایک بار اس نے علی کے منہ سے یہ سنا کہ اسے لڑکیوں کے لمبے بال اچھے لگتے ہیں تو اس نے اپنے بال بڑھانا شروع کر

دیئے۔

اس طرح وہ دونوں لاکھ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے۔ مگر وہ بالکل لاشعوری طور پر علی کی پسند میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ لیکن وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ علی کو یہ چیز پسند ہے تو اسے بھی وہی چیز پسند آئے گی۔

علی کوئی کام کرنا چاہتا تو وہ دل ہی دل میں اس کام کی تکمیل کے لئے دعا گو رہتی۔ علی سے جھگڑنے کی وہ اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ جس دن وہ گھر پر نہ ہوتا، وہ بولائی بولائی سی پورے گھر میں پھرتی رہتی۔

جب وہ اسپیشلائز کرنے باہر گیا تھا تب بھی وہ ایسے بولائی بولائی سی پورے گھر میں پھرتی جیسے کوئی قیمتی چیز کہیں رکھ کے بھول گئی ہو۔ اپنی اس کیفیت پر وہ خود بھی کبھی کبھی جھنجلا جاتی تھی کہ جب وہ پاس ہوتا تو اس سے لڑتی تھی لیکن جب دور ہوتا تو وہ لاشعوری طور پر اس کے آ جانے کی آرزو کرنے لگتی..... یہ کون سا جذبہ تھا..... کون سا احساس تھا..... وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے جب علی کے انکار والی بات سنی تھی تب بھی سب سے پہلا جو خیال اس کے دل میں آیا تھا وہ یہی تھا کہ وہ اس سے چھن جائے گا۔ کسی اور کا ہو جائے گا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی علی سے اگر کوئی لڑکی ہنس کے بات بھی کر لیتی تو اسے برا لگتا تھا کجا وہ پوری عمر کے لئے کسی اور کا ہو جاتا۔ یہ بات وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اسے جھوٹ بولنے پر بھی اسی نا معلوم جذبے نے مجبور کیا تھا۔ نجانے کیسا جذبہ تھا جو اس سے یہ سب کرا رہا تھا، وہ آج تک نہ جان سکی تھی۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ علی ہمیشہ اس کے پاس رہے۔

''ہیلو..... ہیلو..... کہاں ہو بھئی؟'' عرشیہ نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ ہوش میں آئی۔

''یہیں ہوں۔'' وہ چونک کے بولی۔

''آں، ہاں ..... یہاں تو نہیں ہو ..... کسی کے خیالوں میں گم ہو۔'' اس نے زیب کو چھیڑا۔

''بکو مت .....'' وہ اس کا مطلب سمجھ کے جھینپ گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جی! تم وہ گانا گاؤ نا۔ پھر دیکھو بھائی کیسے وارد ہوتے ہیں؟"

"کون سا......؟" بڑی بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکلا اور عرشیہ کے قہقہے نے اسے شرمندہ کر دیا۔

"موسم ہے عاشقانہ...... اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لاتا۔" وہ لہک لہک کے گنگنانے لگی۔

"تم گاؤ ارسلان بھائی کے لئے یہ گانا۔" زیب نے اس کے منگیتر کا نام لے کر چھیڑا۔

"وہ تو پرسوں ہی آئیں گے۔" وہ بنا شرمائے بولی۔

"اچھا عرشی! یہ بتاؤ کہ محبت کیسا جذبہ ہوتا ہے؟ ہمیں کیسے پتہ لگتا ہے کہ ہمیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"ویری سمپل ...... جب راتوں کی نیند اُڑ جائے ...... دل کا قرار لٹ جائے ...... بھوک ختم ہو جائے ...... پیاس نہ لگے، بندہ چائے بنانے بیٹھے تو چینی کی جگہ نمک اور پتی کی جگہ گرم مسالہ ڈال بیٹھے، جب اس کا نام پوچھا جائے تو جواباً وہ اپنے "ان" کا نام بتا دے۔ اسی قسم کی عجیب و غریب حرکتیں جب آدمی کرنے لگے تو سمجھ جاؤ کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔" وہ چیونگم کا پیکٹ کھولتی ہوئی سنجیدگی سے محبت کی "ڈیفی نیشن" کر رہی تھی۔

"بک چکی ہیں آپ؟" اس قدر غیر سنجیدہ جواب پر اس کا منہ بن گیا۔

"ویسے ڈیئر! تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" اس نے پیکٹ زیب کی طرف بڑھایا۔

"کچھ نہیں۔" زیب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں......" عرشیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ایک بات بولوں؟ ...... ہمارا بچپن اکٹھے گزرا ہے۔ میں تمہارے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ تم بھابی بعد میں ہو اور دوست پہلے ...... ہاں زیب! میں تمہاری وہی سہیلی تو ہوں جس سے تم اپنے دل کی ہر بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی مجھ کو نند نہیں بلکہ سہیلی سمجھو۔ بتاؤ کیا پرابلم ہے؟" وہ نرمی سے بولی۔

'مجھے علی کے رویے کے متعلق نہیں بتانا چاہئے۔ علی تو پہلے ہی بدظن ہیں مجھ

سے۔ اگر غصے میں آ کے کوئی قدم اٹھا لیا تو......' اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہ گیا۔

"عرشی! نجانے کیوں مجھے بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ...... کہ علی مجھ سے...... محبت نہیں کرتے ...... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"ارے پاگل ہو بالکل ...... بھائی کے بارے میں وہم مت کرو بچی۔ وہ بہت چاہتے ہیں تمہیں۔" عرشیہ اطمینان سے بولی۔

"تم اتنے وثوق سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟" زیب نے اسے دیکھا۔

"اس لئے کہ میں اپنے بھائی کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ تم ان کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو۔ سمجھیں۔"

"پتہ نہیں......" اس نے اکتا کے سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔ "عرشی! میں نے تم سے محبت کے بارے میں ایک سوال کیا تھا۔"

"زیبو! محبت جو ہوتی ہے ناں تو اس کے ہزار ہا رنگ ہیں اور ہر رنگ دوسرے سے حسین ہوتا ہے اور تمہیں بھی تو بھائی سے محبت ہے۔" اور عرشیہ کے "انکشاف" پر وہ چونک گئی۔

"کیا......؟" وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"ہاں اور کیا ...... کبھی اپنے اندر چھپی اس محبت کو کھوجو تو سہی۔" وہ مسکرا کے بولی۔

اسی وقت خالہ کریمن نے عرشیہ کو اطلاع دی کہ اس کا فون ہے۔ وہ اندر چلی گئی اور زیب بے چین ہو کے کمرے میں چلی آئی۔

'تو کیا واقعی میں "ان" سے محبت کرتی ہوں......؟ ہاں شاید...... تبھی تو ان کے انکار کو سہہ نہ سکی تھی ...... حالانکہ یہ کوئی ایسی خاص بات نہ تھی ...... مگر شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش گھر کر چکی تھی کہ علی صرف میرے ہیں۔ میں کسی قیمت پر انہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے میں نے تائی امی سے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔ صرف ان کو پانے کے لئے ...... مجھے یاد ہے وہ لڑکی چندن ...... جب جب وہ علی کو دیکھتی تھی (کیسی گہری نظریں تھیں اس کی) تو مجھے کتنا برا لگتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وقت علی کو وہاں سے کسی بہانے اٹھا دوں تاکہ وہ اس لڑکی کی نظروں سے دور رہیں ..... پھر بی بی جیسی سادہ لوح لڑکی کا علی کے کمرے میں ہونا کتنا کھٹکتا تھا مجھ کو ..... حالانکہ میں جانتی ہوں کہ علی کا کردار کتنا مضبوط ہے ..... ان کو خود پر کتنا اختیار ہے ..... وہ عام مردوں سے ہٹ کر ہیں۔ لیکن پھر بھی میں ڈرتی ہوں ..... اس لئے کہ وہ تو میرے لئے کوہ نور ہیرے کی طرح ہیں۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی جدائی بھی اسے خوف زدہ رکھتی ہے۔ میں نے ہمیشہ ہی لاشعوری طور پر ان کی پسند کا احترام کرتے ہوئے، اس کو اپنایا ہے۔ مجھ پر آج ہی یہ عقدہ کھلا ہے کہ میں ان کو چاہتی ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ بچپن سے ..... کیسا عجیب لگ رہا ہے نا اس ''اعتراف'' کے بعد اور اچھا بھی لگ رہا ہے۔ سوچتی ہوں کہ آج تک میں غلط تھی۔ لیکن اب جب کہ مجھ پر یہ باور ہو چکا ہے کہ میں ان کو چاہتی ہوں تو میں اپنی ہر زیادتی کی تلافی کروں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت ضدی ہیں۔ لیکن عورت کو اپنی ضد مرد کی خاطر توڑنی پڑتی ہے ..... میں نے بھی ضد کی اور خود ہی ٹوٹ گئی ..... لیکن اب میں ان کو محبت سے جیتوں گی ..... مجھے اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ کیونکہ علی جیسا شخص صرف محبت ہی سے زیر ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی انہیں اپنی محبت سے پانا ہو گا۔ ورنہ کہیں میں انہیں کھو ہی نہ دوں۔'

اپنی ڈائری میں دل کا تمام حال لکھ کر وہ بہت پُرسکون ہو گئی تھی۔

✲

علی منگنی سے ایک دن پہلے پہنچا تھا اور سب گھر والوں نے اچھی خاصی خبر لی تھی اس کی۔ زیب کے دل میں آج دھڑکنوں کے انداز ہی کچھ اور تھے ..... منگنی بہت سادگی سے ہو گئی تھی۔ ارسلان سے علی ملا تھا۔ اسے لڑکا پسند آیا تھا۔

رات کے کھانے پر وہ لوگ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ جب مرد حضرات اور ساری نوجوان پارٹی تتر بتر ہوئی اور وہاں صرف تائی امی، علی اور سلمٰی چچی اور زیب رہ گئیں تو تائی امی نے بات چھیڑی۔

''علی بیٹا! تم دونوں کی شادی کو خیر سے دوسرا سال چل رہا ہے لیکن بٹیا (زیب) کے پیر ابھی تک بھاری نہیں ہوئے ہیں۔ تم اتنے بڑے ڈاکٹر ہو، اس کا علاج کیوں

نہیں کرتے؟'' اور زیب کے جسم کا تمام لہو سمٹ کر چہرے پر آ گیا۔ علی نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''امی! آپ کی خواہش بھی پوری ہو ہی جائے گی۔ لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو خود ہم بچے ہیں۔'' وہ ہنس کے بولا۔

رات کو جب زیب ساری پیکنگ کرنے کے بعد اطمینان سے بیٹھی تو اسے تائی امی کی بات یاد آ گئی اور اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تیر گئی۔

''یہ چپکے ہی چپکے کس بات پر مسکرایا جا رہا ہے؟'' وہ حسب عادت رات کو غسل کرنے کے بعد تولیے سے گیلا سر خشک کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں.....'' اس نے پلکیں جھکا لیں۔ علی نے گیلا تولیہ اسٹینڈ پر لٹکایا اور بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''امی جان نے پہلی دفعہ مجھ سے کچھ مانگا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ چھ سات پوتے تو گفٹ کر ہی دوں انہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چھ سات.....'' وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی کہ علی کے تیور تو کچھ ایسے ہی تھے۔

''ہاں بھئی ..... بلکہ میرے حساب سے تو یہ بھی کم ہیں۔''

''خدا کے لئے کچھ رحم کریں۔ یہ سوچیں کہ بھگتنا مجھ کو ہی پڑے گا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''صرف تمہی کو.....؟'' علی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گڑبڑا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

✲

دن آہستہ آہستہ آگے ہی آگے سرکتے جا رہے تھے۔ کب ان کی شادی کو پانچ سال گزر گئے پتہ ہی نہ چلا۔ اس عرصے میں ان کی چھوٹی سی دنیا کو اطہر اور ذیشان نے اس دنیا میں آ کے مکمل کر دیا تھا۔ زیب کا رویہ تو اس کے ساتھ کافی بہتر تھا لیکن علی کے رویے میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ وہ آج بھی چندن کی یاد اپنے دل میں بسائے بیٹھا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خلیل احمد کا انتقال ہو چکا تھا۔ خالہ تہذیب بھی سفر آخرت پر روانہ ہو چکی تھیں۔ ''المیات'' نے ان پانچ سالوں میں بہت ترقی کی تھی اور علی بھی کامیابیوں کی منازل طے کرتا کرتا بہت بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ علی اپنے دونوں بیٹوں سے بہت پیار کرتا تھا لیکن عاصم کی یاد سے وہ غافل نہ تھا۔ اس کا دل ابھی تک اپنے اس بیٹے کے لئے تڑپتا تھا جسے اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی اپنے سینے سے لگایا تھا۔ نجانے وہ کتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ نجانے وہ کیسا ہو گا۔ خالہ نے تو بتایا تھا کہ اس کی آنکھیں بالکل چندن جیسی ہیں ..... یقیناً بہت حسین ہو گا ہمارا بیٹا ..... وہ اکثر سوچتا اور پھر یہی سوچ اسے اداس کر دیتی۔ زیب آج تک اس کی اداسی کا راز نہ جان سکی تھی ..... علی کو یاد تھا کہ احمر کی پیدائش پر سب کتنے خوش تھے۔

''دیکھا بھائی! کیسا انمول تحفہ دیا ہے زیب نے آپ کو۔'' عرشیہ مسکرا کے کہہ رہی تھی۔

''سارا کریڈٹ بھابی کو دے دیا۔ حالانکہ اس میں میرا شیئر بھی تھا۔'' وہ نہایت آہستگی سے بولا تھا اور اس کی سرگوشی کو سن کر زیب کے چہرے پر کیسے رنگ بکھر گئے تھے۔

'چندن پر بھی ایسا ہی روپ آیا ہو گا میرے بیٹے کی پیدائش کے بعد' اس نے سوچا۔

''نام کیا رکھیں؟'' زوبیہ کو نام رکھنے کی بہت جلدی تھی۔

''حمزہ ..... نہیں سارو ..... یہ کیسا نام ہے .....؟ نہیں، فائز ٹھیک ہے .....'' سب اپنی اپنی پسند بتا رہے تھے۔

''چلو، جھگڑا یہیں ختم کرتے ہیں ..... نام علی ہی رکھے گا۔'' کامران نے جھگڑا ہی ختم کر دیا۔

''احمر۔'' وہ بیٹے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''علی اور احمر، ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کیوں امی؟'' سب کو ہی نام پسند آیا تھا۔

'نجانے چندن نے ننھے عاصم کے نام کے لئے کتنا سوچا ہو گا .....' سوچ کا رخ پھر اس کی طرف مڑ گیا تھا۔

''اسی خوشی میں ایک زبردست سا فنکشن بھی ہو جائے۔'' نوجوان پارٹی نے ہلہ مچا دیا۔

''بالکل بھئی ..... لیکن پہلے قرآن خوانی ہو گی۔'' بزرگ حضرات بولے۔

تب بھی اس نے ایک بار عاصم کے بارے میں ضرور سوچا تھا۔ کتنے دن گزر گئے تھے۔ دن یا صدیاں .....؟ وہ چندن اور عاصم کی یاد میں گم تھا۔ زیب کو اس نے ابھی تک کچھ نہ بتایا تھا۔ سچ کا بوجھ اپنے سینے پر لئے وہ زندہ تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ اسے سب کچھ بتا دے۔

اس روز وہ گھر بہت دیر سے آیا تھا۔ ہسپتال میں کوئی ایمرجنسی تھی جس کی وجہ سے اسے گھر دیر سے آنا پڑا تھا۔ جس وقت اس نے کمرے میں قدم رکھا تو ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور زیب بستر پر یوں لیٹی تھی کہ جیسے بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی ہو۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرا بیڈ پر جس میں ایک سیاہ رنگ کی ڈائری تھی۔ علی جس وقت کپڑے تبدیل کر کے آیا تب بھی وہ اسی پوزیشن میں لیٹی تھی۔

علی نے بڑی آہستگی سے اس پر کمبل ڈالا اور پھر جیسے ہی ڈائری اٹھانے لگا تو اپنا نام دیکھ کر چونک سا گیا۔ پھر انسان میں تجسس کا مادہ ضرور ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ زیادہ ہی تھا۔ گو کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی مگر پھر بھی اس سے سرزد ہو گئی۔ اس نے ڈائری پڑھنی شروع کر دی۔ پھر جیسے جیسے وہ ڈائری پڑھتا جا رہا تھا، نئے نئے انکشافات ہوتے جا رہے تھے۔ زیب نے اپنے دل کی ہر بات اس میں رقم کر رکھی تھی۔ ڈائری کے آخری صفحات میں آج کی تاریخ میں جو لکھا تھا وہ تحریر کچھ یوں تھی۔

''12 دسمبر ..... آج ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ ہے۔ میں آج بھی ہمیشہ کی طرح اس انتظار میں ہی رہی کہ شاید علی کو یہ دن یاد ہو اور وہ مجھے وش کریں۔ لیکن آج بھی ان کو کچھ یاد نہ تھا۔ سات سال ..... اور ان سات سالوں کی ہر رات اور ہر دن میں نے اس امید میں گزار دیا کہ شاید وہ مجھ سے کبھی پیار سے بات کر لیں۔ شاید وہ میری اک چھوٹی سی خطا معاف کر دیں۔ شاید انہیں میرے جذبات، میرے احساسات کا خیال آ جائے اور وہ مجھے معاف کر دیں۔ میں آج تک ان کی صرف

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ایک محبت بھری نگاہ کی تمنائی رہی ہوں ..... کیونکہ میں آج بھی اسی شدت سے انہیں چاہتی ہوں اور آج بھی امید کرتی ہوں کہ شاید کبھی تقدیر ان کے دل میں میرے لئے پیار ڈال دے۔"

ڈائری بند کر کے علی نے ایک نظر گہری نیند سوئی ہوئی زیب پر ڈالی۔ لائٹ بلیو کلر کی نائٹی میں، وہ پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کے لانبے لانبے بال یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔ علی کو اپنی ایک ایک زیادتی یاد آ رہی تھی۔ ایک ایک ظلم یاد آ رہا تھا۔ زیب کا بھی جو رویہ تھا وہ اس کی نظر کے سامنے تھا۔ وہ واقعی اس کو بہت چاہتی تھی۔ تبھی اس کی ہر زیادتی کے جواب میں ہمیشہ چپ ہو جایا کرتی۔ اس نے خود کو علی کی پسند میں ڈھال لیا تھا۔ وہ وہی کرتی جیسا وہ چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنا آپ تیاگ دیا تھا اس پر ..... اور یہ سب محبت کی کرامات تھی۔ کیونکہ محبت ہی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ وہ اپنا آپ منوا کے رہتی ہے۔ پھر وہ تو سب باتوں سے بے خبر تھی انجان تھی۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ علی کی زندگی میں اس سے پہلے کوئی اور بھی آ چکا ہے۔ پھر اس نے محبت کرنے کی بہت سزا بھگت لی تھی اور علی اتنا سنگ دل نہ تھا کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد بھی اس کے لئے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہ ہوتا۔

اس نے آہستگی سے زیب کی پیشانی پر آئی بالوں کی لٹوں کو اپنی انگلیوں سے پیچھے کیا۔ اس کو چھوتے ہی جیسے زیب کی آنکھ کھل گئی۔ اسے خود پر جھکا ہوا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

"میری آنکھ لگ گئی تھی شاید۔" وہ آہستگی سے بولی۔ علی برابر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ تلاش کرنے میں لگی تھیں۔

"تم یہ ڈھونڈ رہی ہو شاید۔" علی نے ڈائری اس کے سامنے کر دی۔

"آں ..... ہاں ....." زیب نے جلدی سے ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لی۔

'کہیں انہوں نے پڑھ تو نہیں لی؟' وہ سوچ رہی تھی۔

"کھانا کھایا آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ..... ڈنر باہر ہی کر لیا تھا۔" علی بولا۔ پھر کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی کا

راج رہا۔ "زیب ....." علی کی بھاری آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔

زیب اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آج ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ ہے نا؟" اس نے کہتے کہتے بہت ہی غور سے زیب کے چہرے کو دیکھا۔

"جی ....." وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ گئی۔ "آ ..... آپ کو یاد ہے؟"

"نہیں ..... یاد نہیں تھا۔ لیکن ..... میں نے تمہاری ڈائری پڑھ لی تھی۔" وہ صداقت سے بولا۔

"اوہ ..... میں بھی کہوں کہ آج آپ کو یہ دن کیسے یاد رہ گیا۔" وہ گہری سانس لیتی ہوئی افسردگی سے بولی۔

"لیکن آج مجھے یہ اعتراف بھی کر لینے دو کہ تمہارے دل میں میرے لئے جو پیار بھرا ہوا ہے وہ آج مجھ پر عیاں ہو گیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا اور کہتے کہتے زیب کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے "اتنا چاہتی ہو مجھے.....؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ زیب کی پلکیں جھک گئیں۔

"خود سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"زیب! جو کچھ تم نے کیا، اپنی محبت سے مجبور ہو کے کیا ..... شاید ہم لوگ محبتوں کے سامنے ہی مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ تبھی وہ کچھ کر بیٹھتے ہیں جن کے متعلق بسا اوقات ہم کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم غلط کر رہے ہیں یا صحیح ..... بہرحال محبت میں انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ محبتوں کے سامنے کیسے ہار مان جاتا ہے، میں جان چکا ہوں۔ قصور تمہارا بھی اتنا نہیں تھا۔ جتنی سزا میں نے تمہیں دی وہ تمہارے قصور سے بہت زیادہ تھی۔ شاید برسوں میرے دل و دماغ پر انتقام کا جذبہ کسی بھوت کی طرح سوار رہا ہے لیکن اب ... آج... جب کہ میں نے اس ڈائری کو پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ یہ بھی سچ ہی ہے اور تمہارے لئے بہت کڑوا ہو گا کہ آج تک میں اپنے دل میں تمہارے لئے محبت نامی کسی جذبے کو پیدا نہ کر پایا تھا ..... لیکن آج میں اتنا کہوں گا کہ تمہاری محبت کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شدتوں نے میرے دل کو موم بنا دیا ہے۔ تم سے میرا کوئی قلبی تعلق نہیں تھا لیکن آج میں اتنا کہوں گا کہ مجھے کچھ وقت دو کہ میں تمہارے لئے اپنے دل میں کوئی جگہ بنا سکوں۔"

وہ بہت نرم اور صاف انداز میں کہہ رہا تھا۔ زیب چند لمحوں تک اس کو دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس کے کندھے سے پیشانی ٹکا کے رو دی۔

'اس لمحے کا کتنا طویل انتظار کیا ہے میں نے ...... دیر سے سہی لیکن شکر ہے یہ لمحہ میری زندگی میں آیا تو سہی۔ آج میری دعائیں رنگ لے آئی ہیں ...... شاید اپنی محبت کی گرمی سے ان کے دل کو پگھلا کر پوری طرح کسی دن اس میں گھر کر جاؤں اور وہی دن میرے لئے بھی جیت کا دن ہوگا اور اس جیت میں کسی انا کا دخل نہ ہوگا۔ یہ جیت تو میری محبت کی جیت ہوگی۔' وہ سوچ رہی تھی اور اسے اپنے وجود کے گرد علی کی مضبوط بانہوں کا گھیرا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سکون سے آنکھیں بند کرلیں۔

لیکن علی سوچ رہا تھا کہ چندن کی یاد سے اس کا دل اس قدر بھرا ہوا ہے کہ زیب کی محبت کے لئے اسے خالی کرنے میں شاید عرصہ بیت جائے کہ یہ پاگل دل ابھی تک اسیرِ الفت تھا......!

(ختم شد)

خواتین رائٹرز کے مقبول ناول شائع ہو گئے ہیں

تیری الفت میں صنم — اقراء صغیر احمد — قیمت -/300 روپے

خواب رنگ اور راستے — نگہت سیما — قیمت -/200 روپے

لہو رنگ زندگی بدلا — اسماء حلیم — قیمت -/250 روپے

سبز رُتوں کی جھلمل میں — عفت سحر پاشا — قیمت -/200 روپے

دیگر خواتین رائٹرز کے مقبول ناول

کوئی لمحہ گلاب ہو	نگہت عبداللہ	-/450 روپے
اے شمع کوئے جاناں (مکمل)	عشنا کوثر سردار	-/600 روپے
آتی رُت بہاری	زاہدہ پروین	-/250 روپے
کچھ جنوں کی رُت شوق وی وی	آسیہ مرزا	-/350 روپے
کوئی جگنو ہو	انجم انصار	-/200 روپے
بہاروں کے سنگ سنگ	اقراء صغیر احمد	-/300 روپے
چاند نگر اور چاندنی	اقراء صغیر احمد	-/300 روپے
تم میری زیست کا حاصل ہو	اقراء صغیر احمد	-/100 روپے
بجھے دیے جلے	عابدہ نرجس	-/200 روپے
سکوتِ شب کے جگنو	رخ چوہدری	-/200 روپے

ساحلوں کے گیت	رخ چوہدری	-/400 روپے
دشتِ دل	رخ چوہدری	-/225 روپے
پھولوں کو مرجھانے نہ دینا	عابدہ نرجس	-/180 روپے
جھونکا بہار کا	عابدہ نرجس	-/225 روپے
ثُریا	راحت وفا	-/300 روپے
دُھند	بلقیس کنول	-/300 روپے
بھیگی پلکیں	نجیبہ خاتون	-/150 روپے
شکوہ	نجیبہ خاتون	-/90 روپے
شکر	نجیبہ خاتون	-/100 روپے

ناشر: مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور

فون: (042) 7668958-7352835-0300-4183997